ماہنامہ

ترجمان القرآن

اگست ۱۹۹۳ء

جاری کردہ :

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ ۔ لاہور (پاکستان)

ترجمۂ قرآنِ مجید

مع مُختصر حواشی

سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی

اس میں مترجم نے قرآنِ حکیم کے متن اور
تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی
درج کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآنِ مجید کا سیدھا سادہ
مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جِلد میں

تفہیمُ القرآن

کے خلاصے سے فائدہ اٹھا سکیں

سائز: $\frac{23 \times 36}{16}$ ● صفحات: ۱۵۸۴ ● ہدیہ: -/۱۷۵ روپے

إدارہ ترجُمانُ القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور

فون: ۲۳۶۶۶۵ - ۲۳۴۰۱۴ ● پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

جلد ۱۱۹ اگست ۱۹۹۳ عدد ۸

ماہنامہ ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ **ترجمان القرآن** لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

جلد ۱۱۹ عدد ۸

اگست ۱۹۹۳ صفر المظفر ۱۴۱۴ھ

فہرست مضامین

مرکز ادارت: منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰ فون نمبر ۴۳۴۱۰۲۴ ٹیلیکس ۴۴۴۱۹ ۰۴۴۲

برائے انتظامی امور رحمان مارکیٹ، اردو بازار، لاہور ۵۴۰۰۰ فون نمبر ۲۲۳۰۱۴ ۲۳۶۶۶۵

پوسٹ بکس نمبر ۱۴۴۳

زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ مینیجر ترجمان القرآن لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔

ڈراس چیکس قابل وصول نہ ہونگے۔

قیمت [illegible] روپے زر سالانہ: ۶۰ روپے (اندرون ملک)

عرب ممالک، خلیجی امارات و برصغیر: ۱۸۰ روپے یورپ: ۲۵۰ روپے امریکہ و آسٹریلیا: ۳۲۵ روپے

میاں فاروق مودودی نے ملک عبدالمجید پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرم مراد

پاکستان اپنی تقریباً نصف صدی کی مختصر سی زندگی میں مسلسل ایک بحران کے بعد دوسرے بحران کا شکار رہا ہے۔ لیکن یہ کہنا بلا مبالغہ آج اسے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ خطرناک بحران کا سامنا ہے۔ ہر بحران کی ہمیں بڑی بھاری قیمت بھی ادا کرنا پڑی ہے۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۱ میں تو اپنے جسم کا آدھا حصہ کاٹ کر دینا پڑا ہے۔ لیکن اس وقت اتنا تو تھا کہ، سوائے ان کے جو شتر مرغ کی طرح ریت میں اپنا سر چھپائے رکھنے پر مصر تھے، ہر جاننے والا جانتا تھا کہ اب ماضی کی بداعمالیوں کی اتنی قیمت ادا کیے بغیر کوئی چارا نہیں۔ لیکن آج کوئی بھی ہوش مند یہ بازی لگانے کی جراءت نہیں کر سکتا کہ اس بحران کی قیمت، آج اور مستقبل میں، کتنی بھیانک ادا کرنا ہوگی۔

پھر، جب کسی بحران سے "نکلے"، تو اس طرح کہ اسباب کا کچھ ازالہ نہ ہوا، ہاں مارشل لا اور ناقص یا مصنوعی انتخابات جیسی تدابیر کے ذریعہ حالات کو پر سکون کر دیا گیا۔ اس مصنوعی سکون پر بہت سوں نے اطمینان کا سانس لیا، اور قلم کاروں نے مدح و توصیف کے گیت لکھنے کے لیے قلم سنبھال لیے۔ مگر ایسی ہر تدبیر نے ایک اور سنگین تر بحران کو جنم دیا۔ ۱۹۵۳ سے ۱۹۶۹ تک جن تدابیر سے بحران دور کیے گئے، ان کے نتیجہ میں ملک کو تقسیم، سول مارشل لا اور پیپلز پارٹی کے دور عذاب سے گزرنا پڑا۔ ۱۹۷۷ سے ۱۹۹۳ تک کی تدابیر نے ہمیں آج یہاں لا کر کھڑا کر دیا ہے ---- ۱۹۹۳ ہم نے اس لیے لکھا کہ، جب تک یہ سطور آپ تک پہنچیں گی، غالباً ایک دفعہ پھر کوئی نہ کوئی مصنوعی تدابیر اختیار کی جا چکی ہوگی، کیونکہ حقیقی حل کے لیے قدم اٹھانے کو اب بھی کوئی تیار نہیں ---- یہ تدابیر اب ہمیں کس آتش فشاں تک لے جائیں گی، اس کے تصور سے بھی دل کانپ اٹھتا ہے۔ اگرچہ دعا بھی ہے، تمنا بھی، اور کوشش بھی، کہ ملک کو چلانے والے اسے کسی بڑے حادثہ سے دوچار نہ کر دیں۔

طوائف الملوکی کی اصطلاح اسپین کے دور زوال کی یادگار ہے۔ اس وقت ہر طائفہ نے اپنی آزاد مملکت قائم کرلی تھی یہ ایک طرف ایک دوسرے کا نام و نشان مٹانے کے درپے تھیں' تو دوسری طرف عیسائی دشمنوں کی رضا جوئی کے لیے کوشاں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ابوعبداللہ کو غرناطہ کی آخری مملکت کی کنجیاں فرڈ-نننیڈ اور ایزابیلا کی خدمت میں پیش کرکے رخصت ہونا پڑا' اور اسپین سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ خلافت عباسی کا آخری دور ہو یا مغلیہ سلطنت کا دور زوال' نقشہ یہی نظر آتا ہے۔ کبھی ایک صوبہ علم بغاوت بلند کرکے خود مختار ہوتا تھا' کبھی دوسرا۔ مرکزی حکومت بغداد' دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی' اور وہاں بھی کہیں خلیفہ اور بادشاہ' کہیں وزیراعظم اور سپہ سالار' اقتدار کی کشمکش میں مسلسل ایک دوسرے کو اختیار سے بے دخل کرتے اور خود قابض ہوتے رہتے تھے۔

بدقسمتی کی بات ہے کہ آج پاکستان اسی قسم کی طوائف الملوکی کا شکار ہے۔ مرکز میں ایک آزاد "مملکت" جناب صدر نے اپنی بنالی ہے' ایک جناب وزیراعظم کی ہے۔ دونوں ایک گھمسان کی (سیاسی و قانونی) جنگ میں ایک دوسرے کے ساتھ برسرپیکار ہیں' اور ایک دوسرے کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہیں۔ یہ جنگ اس لیے اور خوفناک بنتی جارہی ہے کہ مملکت کے دستوری سربراہ صدر ہیں' جب کہ انتظامی سربراہ وزیراعظم۔ لیکن مملکت ایک ہی ہے' اور دونوں کے لیے اپنے اپنے علاقے لے کر الگ ہوجانا ممکن نہیں' مگر دونوں ایک چادر میں سمانے کو بھی قطعاً تیار نہیں۔ پھر کیا اس کھینچا تانی میں کہیں چادر پھٹ تو نہ جائے گی! یا تیسری قوت دونوں کو نکال باہر تو نہ کردے گی!

جناب صدر صرف دستوری سربراہ سہی' لیکن انہوں نے ہر صوبہ کے ہاتھوں میں علم بغاوت تھما کر اسے اپنا حلیف بنا لیا ہے۔ چنانچہ ہر صوبہ کی انتظامیہ جناب وزیراعظم کے خلاف صف آرا ہے' خصوصاً پنجاب اور سرحد کی' کہ جن کے درمیان مرکزی دارالسلطنت ایک محصور شہر بلافصیل ہوگیا ہے۔ یہ طوائف الملوکی کی انتہائی خوفناک صورت ہے۔ وزیراعظم کی حکومت فی الواقع زیرو پوائنٹ تک محدود ہو کر رہ گئی ہے' باقی علاقوں پر صوبوں کی معرفت صدر کی حکومت ہے۔ بحیثیت وزیراعظم صوبوں میں ان کا حکم نہیں چل رہا' بلکہ وہ وہاں جا بھی نہیں سکتے۔ صوبوں کے پاس پولیس کی مسلح قوت ہے' جب کہ وزیراعظم کے پاس کوئی قوت نہیں جو ان کا حکم ماننے کو تیار ہو۔ ان مرکزی ملازمین کو بھی' جو صوبوں میں متعین ہیں' وہ معطل کرتے ہیں تو

صدر' بحیثیت دستوری سربراہ کے' (اگرچہ شاید بلا کسی دستوری اختیار کے)' انہیں بحال کردیتے ہیں۔ حزب اختلاف بھی' قوت و تعداد میں کم سہی' جناب صدر کی حلیف بن چکی ہے۔ اور اب' صدر کی سربراہی میں' صوبوں اور حزب اختلاف نے اسلام آباد کے محصور دارالسلطنت پر "چڑھائی" کا اعلان کردیا ہے۔ "صدر کی سربراہی" ہم نے اس لیے کہا کہ آج کے سپہ سالار آگے آگے ہونے کے بجائے سب سے پیچھے بیٹھ کر اپنی فوجوں کو لڑاتے ہیں۔

جناب وزیراعظم نے قانون اور عدالت کا دامن تھاما' اور عدالت نے ان کے خلاف جناب صدر کی غیرقانونی کارروائی کو کالعدم قرار دے کر' ان کو سہارا بھی دیا۔ لیکن عدالت کے فیصلوں میں بس اتنی قوت ہوتی ہے جتنی فریقین نفسیاتی طور پر اسے دینے کو تیار ہوتے ہیں۔ یا جتنی ریاستی قوت اس کی پشت پر ہوتی ہے۔

جہاں فریقین سمجھتے ہیں کہ فیصلہ سے سرتابی کی سرمو مجال نہیں' وہاں عدالت کو مکمل قوت حاصل ہوتی ہے۔ جہاں کوئی فریق' جس کو سیاسی قوت حاصل ہو' مان کر بھی نہ مانے یا عدالت پر کیچڑ اچھالنے پر اتر آئے' وہاں عدالت اتنی بے بس ہوجاتی ہے کہ توہین عدالت کی کارروائی بھی کرنے سے عاجز ہوتی ہے۔ اور جہاں ریاست کا وہ بازو جو قوت کا حامل ہوتا ہے' عدالت کی پشت پناہی کے لیے تیار نہ ہو' وہاں بھی فیصلے کاغذ پر دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ کیا جتنا عدالت کے خلاف کہا گیا اتنا قوت قاہرہ کے خلاف کہا جاتا تو اسی طرح سناٹا طاری رہتا؟ ایک دفعہ چند ریڈ انڈین قبائل کو جلا وطن کرنے کے خلاف امریکن سپریم کورٹ نے حکم نامہ جاری کیا' تو امریکہ کے مشہور صدر آدم نے کہا: کرلے سپریم کورٹ اپنا حکم نافذ! --- اور قبائل گھربدر کردیئے گئے۔ اب بھی' زبان قال سے نہیں' زبان حال سے یہی کہا جارہا ہے کہ "سپریم کورٹ اپنا فیصلہ نافذ کرلے" کہ شاید ماضی میں اپنی بے اختیاری کو دیکھتے ہوئے ہی عدالتوں نے وہ فیصلے کیے جو آج ہدف ملامت بنے ہوئے ہیں۔

ملک کے سنگین ترین بحران کو پیدا کرنے اور اس کو برقرار رکھنے' میں یہ واضح ہے کہ اصل کردار جناب صدر کا ہے۔ انہوں نے منتخب اسمبلی اور وزیراعظم کو برطرف کرنے کا ایسا اقدام کیا جس کے بارہ میں ہم نے لکھا تھا کہ اس کا کوئی قانونی' سیاسی' یا اخلاقی جواز نہیں ہے۔ سپریم کورٹ کے فیصلہ نے ہماری اس رائے کی توثیق کردی۔ ان کے سارے اقدامات سے' اور ان کے اقدامات اور بیانات سے بھی ان کا کام کررہے ہیں' یا ان کی ترجمانی کرتے ہیں' یا جنہیں ان

کی پشت پناہی حاصل ہے' یہ بات بالکل عیاں ہے کہ "غلام اسحاق خان" ہر قیمت پر "نواز شریف" کو وزارت عظمیٰ سے ہٹانے پر تلے ہوئے ہیں' اور اس معاملہ میں کسی مفاہمت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی جگہ کوئی آجائے --- بلخ شیر مزاری ہوں' بے نظیر بھٹو یا شہباز شریف --- وہ نہ رہیں۔ ان کے پاس اپنی اس روش کے لیے کیا وجوہات ہیں' اس پر گفتگو کا اس وقت کوئی حاصل نہیں۔ اس سے بھی انکار نہیں کہ وہ دیانتداری سے خود کو حق بجانب سمجھتے ہوں گے' اور ان کے بعض دلائل میں وزن بھی ہوگا۔ لیکن کیا یہ روش ملک کے آج اور کل کے لیے تباہ کن نہ ثابت ہوگی؟

وزیراعظم کی ۱۷ اپریل کی تقریر تو بہت بعد کی بات ہے' جنوری فروری ہی سے ان کے ترجمانوں نے' پبلک بیانات اور پرائیویٹ گفتگوؤں میں' یہ بات پورے زوروشور کے ساتھ کہنا شروع کردی تھی کہ "اب کسی مفاہمت کا کوئی سوال نہیں' نواز شریف کو جانا ہی ہوگا' اس نے بے وفائی اور غداری کے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔" فیصلہ طلب بات صرف یہ رہ گئی تھی کہ یہ خاتمہ اسمبلی کے اندر ممکن ہے (کہ یہ قابل ترجیح تھا) یا اسمبلی ہی کا خاتمہ کرنا ہوگا۔

خود جناب صدر بھی زبان حال سے یہی کہہ رہے تھے۔ ایوان صدر میں جو لوگ بلائے جاتے' اور باہر آکر وہ جو بیانات دیتے' ذرا ان کو کسی کمپیوٹر پر ڈال دیجیے۔ صوبائی وزراء اعلیٰ نے ان کے دوبارہ انتخاب کے لیے جو مہم چلائی اس کو دیکھ لیجیے۔

اس وقت انھوں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں دوسری میعاد کا خواہاں نہیں ہوں)۔ صوبوں نے اچانک وفاق سے شکایات کا جو سلسلہ شروع کردیا اس پر نظر ڈالیے۔ مفاہمت اور مصالحت کی کوششوں کا جو انجام ہورہا تھا اس کو ذہن میں رکھیے۔ ۱۴ اپریل کی ملاقات میں وزیراعظم نے صدر کے سامنے جس طرح سرنڈر کردیا تھا' اس کے جواب میں ان کی روش کو دیکھیے۔ پنجاب میں' جہاں اب تک ان کی براہ راست حکومت نہ تھی' لوٹوں کے ذریعے جس طرح اپنی مرضی کے گورنر اور وزیراعلیٰ کو بٹھایا گیا' اس کو بھی سامنے رکھیے۔ کوئی انصاف پسند آدمی انکار نہیں کرسکتا کہ ایوان صدر منتخب وفاقی حکومت کے خلاف سازشوں کا مرکز بن چکا تھا۔

پھر سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بعد پنجاب اور سرحد کی صوبائی اسمبلیوں کی اچانک تحلیل (جو صدر پہلے اپنی حلیف بے نظیر بھٹو کی ناراضگی کے باوجود کرنے کو تیار نہ تھے)' اور صوبوں کی طرف سے مرکز کے خلاف محاذ آرائی جناب صدر کی پشت پناہی کے بغیر ممکن نہ تھی۔ پنجاب اسمبلی کی دوبارہ تحلیل کے بارہ میں یہ کہنا کہ ان کو علم نہ تھا' اگر سچ بھی ہو تو کس کے لیے قابل

یقین ہوسکتا ہے۔ اور اب یہ "اسلام آباد" کے خلاف لانگ مارچ کی چڑھائی --- اگر پنجاب اور سرحد کی حکومتیں صرف عدم تعاون ہی کریں تو کیا یہ کامیاب ہوسکتی ہے ؟

جناب وزیراعظم کی بے صبریاں اور بے تدبیریاں --- ان کا اپنے قول و قرار میں ناقابل اعتماد ہونا --- اداروں اور روایات کو نظرانداز کرکے بالا بالا کام کرنا --- اختلاف کرنے والوں کے خلاف ان کی زبان اور لہجہ --- اور کلی اختیارات کے لیے ان کی طلب و خواہش --- یہ سب بجا اور درست شکایات ہیں' اور آج کے بحران کو پیدا کرنے میں ان کا بھی اپنا حصہ ہے۔ مگر یہ جناب صدر کی روش کو جواز نہیں فراہم کرسکتیں۔

انہوں نے وزیراعظم بنتے ہی "لمبے چوڑے" دستور سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا' (وہی دستور جو ان کے کام آیا)۔ بارہویں ترمیم کے ذریعہ' دستور' صدر اور ریاست کے تمام اداروں کو بالائے طاق رکھ دینے کے اختیارات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ان کی بے تدبیریوں کا علم یہ ہے کہ پاکستان کی ساری سیاسی تاریخ سے واقف ہونے کے باوجود انہوں نے آٹھویں ترمیم میں صدر کے اختیارات ختم کرنے کی جنگ چھیڑ دی' حالانکہ اس مقصد کے لیے ان کے پاس مطلوبہ دو تہائی تعداد بھی نہ تھی۔ اور واقعتاً نہ اسمبلی ٹوٹنے کا اندیشہ تھا' نہ تین سال تک کسی چیف آف سٹاف کا تقرر ہونا تھا۔ ان کا یہ اقدام صدر کے لیے سرخ الارم کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک طرف وہ اپوزیشن کو غدار قرار دیتے رہے' اور ٹانگیں توڑ دینے اور سمندر میں دھکیل دینے کی دھمکیاں دیتے رہے' دوسری طرف اچانک صدر کے خلاف حمایت کے وعدہ پر انہوں نے نہ صرف انہی محترمہ بے نظیر بھٹو کو امور خارجہ کمیٹی کا سربراہ بنوا دیا اور آصف زرداری کو رہا کروا دیا' بلکہ تعاون کی صورت میں' اخباری اطلاعات کے مطابق' ان کو پانچ وزارتوں کی پیش کش بھی کردی۔

پھر اسمبلی کی تحلیل کے بعد انہوں نے جناب صدر کے خلاف وہ زبان استعمال کی کہ سپریم کورٹ کو بھی اس کا نوٹس لینا پڑا۔ اور اسمبلی بحال ہونے کے بعد' انہوں نے نہ صدر سے رابطہ بحال کیا' نہ اپوزیشن سے' سیدھے پنجاب کی حکومت ختم کرنے کی مہم میں لگ گئے۔ اور سب سے شاہکار بے تدبیری تو یہ کہ پنجاب پر قبضہ کے لیے' اپنے وکیل کے مشورہ کو رد کرکے لاہور ہائی کورٹ میں جانے کے بجائے پارلیمنٹ کو ملوث کرلیا۔ دفعہ ۲۳۴ کے تحت ایسی کارروائی کی کہ جس کا طریق کار' اور کچھ حصہ صریحاً دستور کی خلاف ورزی ہیں' اور جس کو نافذ کرنے کی طاقت

بھی ان کے پاس نہ تھی۔ اس طرح انہوں نے پنجاب کی حکومت خاطر اپنی وزارت عظمٰی کو دا پر لگا دیا' اور اپنی لاچاری اور بے بسی دوست دشمن سب کے سامنے عیاں کردی۔

کیا نواز شریف کو ہٹانے سے بحران حل ہو جائے گا ؟

جناب وزیراعظم کا یہ کردار اپنی جگہ پر' لیکن ہمیں جو بحران درپیش ہے اس کا حل صرف افراد کو اٹھانے اور بٹھانے سے کبھی بھی نہیں ہوگا۔ اگر آج "نواز شریف" نے بے صبری دکھائی ہے' بے تدبیریاں کی ہیں' اختیارات کلی کی ہوس کی ہے' تو کل کوئی دوسرا بھی یہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ اگر آج "نواز شریف" کا خاتمہ اس لیے ضروری قرا دیا جارہا ہے کہ وہ رہ گیا تو اپنی مرضی کا صدر لائے گا' چیف آف سٹاف لائے گا' آمر مطلق بن جائے گا' تو کل کوئی دوسرا بھی یہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ دستور کس "بھٹو" یا "نواز شریف" کو روک سکتا ہے کہ وہ' منصفانہ انتخابات کے ذریعہ' ساری اسمبلیوں میں اکثریت حاصل کرلے' اپنی مرضی کا صدر لے آئے' اس کے ذریعہ اپنی مرضی کا چیف آف اسٹاف لے آئے' اپنی مرضی کی دستوری ترامیم کرلے ؟ اور کیا اصولاً فوج کو ملک کے انتظامی سربراہ کے ماتحت نہیں ہونا چاہیے۔

پھر کیا ایک مقتدر کے آمر بن جانے کے خطرہ کا علاج یہی ہے کہ دوسرے مقتدران کو اس کے برابر' بلکہ اس پر حاوی اختیارات دے دیے جائیں۔ کیا ایک ملک میں دو سربراہ مسلسل فساد پیدا نہیں کرتے رہیں گے ؟ کیا ملک کی فلاح و ترقی اسی میں ہے کہ اس کے مقتدر ادارے ایک دوسرے سے مسلسل دست بگریباں رہیں ؟ ہر دو تین سال بعد کشمکش اقتدار کا بحران پیدا ہوتا رہے' یا مارشل لا کا انجکشن اسے ایک طویل موت نما نیند کی آغوش میں دھکیل دے' کہ جب جاگے تو پہلے سے بدتر حالت میں ہو۔ ملک کا انتظامی سربراہ بگڑ جائے' تو کیا اس کا یہ علاج مناسب ہے کہ دوسرے مقتدران اس کو بہ جبر ہٹا دیں' یا حزب اختلاف عوام کو اس کے خلاف سڑکوں پر لے آئے اور رخصت ہوجانا ہی اس کا فرض پڑے ؟

کیا انتخابات اس بحران کا علاج ہیں ؟

اگر ۱۹۶۹' ۱۹۸۸' اور ۱۹۹۰ کے بحرانوں کا اس طرح علاج نہ ہوسکا' تو اس بحران کا علاج انتخابات سے کس طرح ہوجائے گا ؟ ووٹرز میں کوئی تبدیلی نہ آئے' انتخابات کے نظام و قوانین میں کوئی اصلاح نہ ہو' سیاسی محاذ آرائی کے تیز بخار کی حالت میں انتخابات ہوں' ایک گروہ کو بنوک شمشیر نکال کے ہوں' اس کے مخالفین کو مسند حکومت پر بٹھا کر کیے جائیں' تو ایک بدتر

بحران پیدا نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ بلخ شیرمزاری اور وٹو کی حکومت ہو یا جتوئی اور وائیں کی' ان کے تحت انتخابات ہوں تو کیا ان کو منصفانہ تسلیم کیا جائے گا' سکون و قرار نصیب ہوسکے گا۔ پھر انتخابات کی رٹ لگائے جانے کا مقصد ایک ٹولے کو ہٹانے کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے' خواہ اس کی جگہ اسی کی طرح کوئی بھی دوسرا ٹولہ آکر مسند اقتدار پر بیٹھ جائے۔ یہ کس طرح جائز ہوسکتا ہے کہ حزب اختلاف اسمبلیوں سے استعفے دے دے یا لانگ مارچ منظم کرلے تو اسمبلی توڑ دی جائے یا نئے انتخابات کرانا حل بن جائے۔

ملک میں کوئی مستحکم نظام اس وقت تک کبھی بھی قائم نہیں ہوسکتا جب تک ملک کے منتخب انتظامی سربراہ کو سول اور ملٹری پر اختیار حاصل نہ ہو' اور اس کے سر پر کوئی دستوری تلوار لٹک رہی ہو۔ کوئی آمریت اور بدعنوانی کی راہ پر چلے تو اسے روکنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں کہ اس کو اوپر سے' یا نیچے سے سڑکوں پر احتجاج کے ذریعہ ہٹا دیا جائے۔ وہ آئے تو منصفانہ طور پر رائے عامہ کی حمایت کے بل پر' جائے تو دستور و قانون کے تحت۔ آمریت کی راہ پکڑے یا بدعنوانی کی' تو اس کے دوسرے علاج سوچے جائیں۔ اعلیٰ اور حساس عہدوں پر تقرریوں کی توثیق جمہوری اداروں کے سپرد کی جاسکتی ہے۔ سول ملازمین کو سیاسی دباؤ سے نجات دلانے کے لیے بھی تدابیر موجود ہیں۔ مالی بدعنوانیوں کے لیے بھی چیک قائم کیے جاسکتے ہیں۔ احتساب کا ایک مستقل نظام قائم کرنا بھی ضروری ہے۔ احتساب کا حق ہر شہری کو دیا جاسکتا ہے' اور تمام حکومتی عہدیداروں کو عام شہریوں کی طرح عدالتوں کے سامنے جواب دہ ٹھہرایا جاسکتا ہے' جیسا کہ اسلام کا تقاضا ہے۔ انتخابات کو زیادہ سے زیادہ منصفانہ' انتظامیہ کی مداخلت سے آزاد' اور دھن دولت کے راج سے پاک کرنے کے لیے مناسب اقدامات ممکن ہیں۔ جماعت اسلامی نے اس مقصد کے لئے انتہائی مفید تجاویز پیش کی ہیں۔ لیکن کاش لوگ واقعی اصلاح کے خواہاں ہوتے!

ملک کو درپیش بحران سے نکالنے کے مختلف راستے ہوسکتے ہیں۔

سب سے بہتر راستہ تو یہ ہے کہ صدر' وزیراعظم اور قائد حزب اختلاف مل کر بیٹھیں' آمریت اور بدعنوانیوں کا راستہ بند کرنے کے لیے' انتخابات کے عمل کو منصفانہ بنانے کے لیے' اور عوام کی منتخب کردہ حکومت کو مقررہ مدت تک تحفظ و سلامتی فراہم کرنے کے لیے مناسب مستقل انتظامات سوچیں' اور ان پر تمام سیاسی قوتوں کا اتفاق رائے حاصل کریں۔ ان کو مناسب قانون سازی کے ذریعہ نافذ کردیں۔

باہمی اتفاق رائے سے یہ بھی طے کریں کہ موجودہ حکومت کب تک کام کرے گی' اور آئندہ صدر کون ہوگا۔

اگر اس فارمولے پر عمل در آمد ہو جائے تو ملک کی بہتری کے لیے اس سے بہتر اور کوئی راہ نہیں ہو سکتی۔

۲ - اگر یہ راہ نہ اختیار کیا گئی تو ہر حل میں خرابی کی صورت مضمر ہے۔ لیکن سب سے کم نقصان دہ راستہ یہ نظر آتا ہے کہ ہر سطح پر مکمل غیرجانبدار' (اگرچہ یہ جنس عنقا ہے)' افراد' جن پر فریقین کو اعتماد ہو' اور جو آئندہ انتخابات میں حصہ نہ لیں' حکومت سنبھالیں۔ موجودہ حکومت کا جانا دستوری طریقہ سے ہو۔ انتخابی قوانین اور نظام میں زیادہ سے زیادہ ممکنہ اور متفقہ اصلاحات کر دی جائیں۔ اور اس کے بعد انتخابات کرا دیئے جائیں۔ (ا) انتخابات سے مسئلہ حل تو نہ ہوگا' لیکن نہ کرانے کی صورت میں حالات بدتر ہو سکتے ہیں۔ اس کا امکان نظر نہیں آتا کہ ایسا کوئی حل فریقین خود ماننے پر تیار ہوں۔ ایسی صورت میں تو ان سے منوانے میں بھی دریغ نہ کیا جائے۔ بشرطیکہ منوانے والے اپنی اغراض سے بالاتر ہوں' انصاف سے معاملہ کریں' اور انصاف کرتے ہوئے محسوس بھی ہوں۔

اگر بہ جبر کوئی ایسا سیاسی حل' یا انتخابی فارمولا مسلط کیا گیا جس میں کسی فریق کے ساتھ صریح بے انصافی ہوتی ہو' تو اس سے مزید فساد ہی پیدا ہو گا۔ اور اگر غیردستوری ذرائع سے بحران ختم کیا گیا تو اس کا نتیجہ نہ پہلے اچھا نکلا ہے نہ اب اچھا نکلے گا۔

بنیادی مسئلہ نظام چلانے والوں کے کردار کا ہے۔ کوئی نظام خود سے اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ اگر چلانے والے من مانی کرنے اور لوٹ مار مچانے پر تل جائیں تو ان کو روکا جائے گا۔ خلافت راشدہ کی مسند پر بھی غلط کار افراد بیٹھ جائیں تو ان کی روک تھام مشکل ہے۔ اور اگر تخت شاہی پر کوئی صالح' انصاف پسند اور خادم رعیت فرد بیٹھ جائے تو لوگ سکھ کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اچھے اور موثر قوانین اور نظام اس لئے ضروری ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو خرابی اور فساد کے دروازے بند کر دیئے جائیں' اور کوئی کھولنا چاہے تو اس کا ہاتھ پکڑنے کے انتظامات ہوں۔ لیکن نظام اور قوانین اسی صورت میں اپنے مقصد کے لئے موثر ہو سکتے ہیں۔ جب ان کی نگرانی کیلئے ایک مضبوط رائے عامہ موجود ہو' اور چلانے والے خوف خدا سے خالی نہ ہوں اور نہ نظام و قوانین کا احترام ضروری سمجھتے ہوں۔

پاکستان اور اسلام

اسلامی نظریہ کی طرف بڑھنے میں کون سی قوتیں مزاحمت کر رہی ہیں؟

ایک، عام مسلمان کی جہالت اور اسلامی تربیت سے محرومی۔

ہم جب کبھی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مسلمان ممالک میں، اور اسی طرح پاکستان میں بھی، مسلمان من حیث القوم اسلام کے دلدادہ ہیں، تو اس سے ہماری مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ ان کے جذبات و احساسات اسلامی ہیں، اور روایات کا گہرا اثر ان کو اسلام سے وابستہ رکھے ہوئے ہے۔ لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اور یہ بالکل ایک بدیہی حقیقت ہے، کہ ان عام مسلمانوں کی عظیم اکثریت جس اسلام کی دلدادہ ہے، اس سے نہ تو یہ اچھی طرح واقف ہے اور نہ اس کے اصولوں کے مطابق اس کو اخلاقی تربیت ملی ہے۔

یہ ہماری بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ مغربی استعمار کی آمد سے کئی صدی پہلے سے مسلمانوں کی حکومتیں اپنے بنیادی فرائض سے غافل رہیں اور انہوں نے مسلم عوام کو اسلامی تعلیم و تربیت دینے کا فرض پوری طرح انجام نہیں دیا، اس کے بعد جب مغربی استعمار مختلف اسلامی ملکوں میں اور خود ہمارے ملک میں آیا، تو اس نے ہمارے عقاید، اخلاق، اور تہذیب و تمدن کی جڑیں ہلا ڈالیں۔ اس نے ہم پر ایک ایسا نظام تعلیم، اور نظام سیاست و معیشت، اور نظام قانون و تمدن مسلط کیا، جو ہمارے فلسفہ حیات اور نظام زندگی سے پوری طرح متصادم تھا۔

ان ساری چیزوں کے اثرات مسلمان قوموں میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں، اور اپنے ملک میں بھی ہم ان سے بری طرح متاثر ہیں۔ ہم یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ اگر یہاں نظام حکومت قائم ہو جائے تو عوام کے جذبات واحساسات انشاء اللہ اس کا ساتھ دیں گے۔ لیکن ہمیں یہ غلط فہمی نہیں ہے کہ قوم کی جہالت و جاہلیت اس کے قائم ہونے اور چلنے میں مزاحم نہ ہو گی۔ لا محالہ اسلام کے لیے کام کرنے والوں کو کافی مدت تک جان مار کر محنت کرنا ہوگی، تاکہ قوم کی بگڑی ہوئی عادات و

خصائل کو درست کر کے اس نظام کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے جسے وہ جذباتی طور پر دل سے پسند کرتی ہے۔

اس معاملہ میں اصلاح کرنے والوں کو بڑی حکمت کے ساتھ ایک تدریجی پروگرام اختیار کرنا ہوگا۔ اگر حکمت اور تدریج کو وہ ملحوظ نہ رکھیں' اور کسی وقت بھی اصلاح کی پوری خوراک بیک وقت دے ڈالنے کی کوشش کریں' تو سارا کام بگاڑ کر رکھ دیں گے۔

دوسری مزاحم قوت ہمارے مذہبی طبقوں کا جمود ہے۔

ان لوگوں کو پوری طرح اس بات کا احساس و ادراک نہیں ہے کہ اسلام میں درحقیقت ثبات اور حرکت کے درمیان کس طرح توازن قائم کیا گیا ہے۔ کتاب و سنت کی رو سے مستقل طور پر ثابت و قائم کیا چیزیں رہنی چاہئیں' اور حرکت کن پہلوؤں میں اور کن امور میں ہونی چاہیے جس سے ہم زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ آگے چل سکیں۔ ان کے نزدیک کلیات واصول اور منصوص احکام سے لے کر استنباطی جزئیات و فروع تک ہر چیز اٹل ہے۔

اس جمود کی وجہ سے بھی بہت سی رکاوٹیں اب تک پیش آئی ہیں' اور آگے بھی پیش آنے کا خطرہ ہے۔ اگر اصلاح کے لیے کام کرنے والے لوگ وہ ہوں جو قرآن و سنت اور فقہ اور اسلامی تاریخ پر اچھی نظر رکھتے ہوں' فرقہ بندی کے تعصبات میں مبتلا نہ ہوں' اور اپنے مزاج میں حکیمانہ اعتدال اور صبروتحمل بھی رکھتے ہوں' تو یہ مزاحمت تھوڑی یا بہت مشکلات کے باوجود رفع ہو سکتی ہے۔ ورنہ کم علم اور غیر معتدل لوگوں کے ہاتھوں یہ کام ہونے کی صورت میں سخت اندیشہ ہے کہ ہم اصلاح کرنے کے بجائے ملک میں مذہبی جھگڑے برپا کر دیں۔

تیسری مزاحم طاقت ملک کے اندر نہیں بلکہ باہر ہے۔

ہمارے مغربی دوست جن کے ساتھ ہم بہت سے مالی و معاشی و سیاسی رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں' اور جنہیں ہمارے آزاد ہو جانے کے باوجود ہماری قسمت پر اثر ڈالنے کے بہت سے مواقع حاصل ہیں وہ خود چاہے کتنے ہی عیسائی ہوں اور عیسائیت پر فخر کریں اور کیمونزم کے مقابلے میں مذہب کے علمبردار نہیں' مگر مسلمان قوموں کو وہ مسلمان نہیں دیکھنا چاہتے۔ میرا احساس یہ ہے کہ وہ اب تک کیمونزم کے مقابلے میں اسلام کو زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں ان کی خواہش یہ تو ضرور ہے کہ مسلمان قومیں مذہب کی بنیاد پر کیمونزم کی مخالف ہوں اور اس کی مقابلے میں ان کا ساتھ دیں۔ لیکن جب کبھی کسی ملک کو وہ اسلام کی طرف پلٹتے دیکھتے ہیں اور انہیں خطرہ ہوتا ہے

کہ اب جہاں اسلام کا بول بالا ہونے والا ہے' تو اپنی تمام جمہوریت نوازی کو چھوڑ کر اور اپنے تمام اصول آئین و قانون کی نظرانداز کر کے وہ اس قوم کے اندر غیر آئینی انقلاب کی ہمت افزائی کرنے پر اتر آتے ہیں۔ جمہوریت کے مقابلے میں ڈکٹیٹر شپ کی حمایت کرنے لگتے ہیں اور انتہائی وحشیانہ ظلم و ستم جو دینی رہنماؤں اور دینی کارکنوں پر کیا جائے' اس پر نعرہ ہائے تحسین و آفرین بلند کرتے ہیں۔ یہ تماشا ہم کئی برس سے مسلسل دیکھ رہے ہیں' اور ہمیں یہ یقین ہو چکا ہے کہ مسلم ممالک کے اندر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے راستہ میں صرف اندرونی طاقتیں ہی مزاحم نہیں ہیں بلکہ ان کی پشت پر یہ بیرونی طاقتیں بھی ہیں۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہماری جنگ آزادی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ ہمیں آزادی کے لیے ابھی مزید لڑائی لڑنی ہے۔

پھر بدقسمتی سے اس وقت دنیا کی سب سے بڑی بین الاقوامی طاقت یعنی امریکہ پر ایک شیطان کا سایہ بھی ہے۔ اس شیطان کا نام ہے یہود۔

بین الاقوامی سازشیوں کے اس خطرناک گروہ کے ہاتھ میں بہت بڑی معاشی طاقت بھی ہے اور پریس کی طاقت بھی۔ خصوصیت کے ساتھ امریکہ کی خارجہ سیاست پر اس کو جو تسلط حاصل ہے' اس نے تمام امریکیوں کو ان کی خواہش اور ارادے کے بغیر نہ صرف عرب سے' بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں سے' زبردستی بھڑا دیا ہے۔ یہ یہودی حقیقت میں امریکہ کے لیے' انگریزی محاورہ کے مطابق' نفس امارہ Evil Genius بنے ہوئے ہیں۔

جس مسلمان قوم کے اندر مذہبی احیاء کے آثار نمودار ہوتے ہیں' یہ اس کے متعلق فوراً دنیا میں خطرے کی گھنٹی بجانے لگتے ہیں اور اس کی خبریں دنیا کو اس طرح سناتے ہیں جیسے دنیا میں کوئی بڑی آفت آنے والی ہے۔ اگر کسی مسلمان قوم میں الحاد اور بے دینی کا زور ہو رہا ہو تو یہ اس پر بغلیں بجاتے ہیں اور دنیا بھر کو خبر دیتے ہیں کہ وہ قوم بڑی ترقی کر رہی ہے۔ بہت Progressive ہو گئی ہے۔ اگر کہیں کسی دینی تحریک کو کچلا جا رہا ہو' مقدمے چلائے بغیر لوگوں کو قید کیا جا رہا ہو' فوجی عدالتوں میں بالکل مضحکہ خیز طریقوں پر مقدمات چلا کر لوگوں کو پھانسیوں کی سزائیں دی جا رہی ہوں تو اس کی خبریں دنیا کو اس انداز سے دیتے ہیں گویا کوئی بہت بڑا نیک کام کیا جا رہا ہے۔ اور کوئی شرم ان کو ایسے افعال کی تحسین کرتے وقت لاحق نہیں ہوتی۔ اگر کسی مسلم ملک میں جمہوریت کو بالائے طاق رکھ کر اور آئین و قانون کی مٹی پلید کر کے کوئی ڈکٹیٹر شپ قائم کر دی جائے' تو اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور دنیا کو یقین دلاتے ہیں کہ مسلمان قومیں جمہوریت کے قابل ہی نہیں ہیں۔ ان کے لیے تو ڈکٹیٹر شپ ہی موزوں ہے۔

امریکہ کے عام باشندے ذرا محسوس نہیں کرتے کہ اس طرح اپنی اغراض کے ۔لیے یہودی سرمایہ دار اور یہودی پریس ان کو گواہ کر کے ایک خطرناک بین الاقوامی الجھن میں مبتلا کر رہے ہیں۔ وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ عملاً یہی اس وقت امریکہ کی پالیسی ہے اور یہودیوں کے زیر اس کی سیاسی طاقت اسی پالیسی کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ سے امریکہ کی وہ تمام .ی اور فنی امداد جو وہ مسلمان ملکوں کو دیتا ہے' بجائے کوئی خیر سگالی پیدا کرنے کے' الٹا اثر مرتب کر رہی ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمان' اس کے باوجود کہ کمیونزم کے مقابلے میں ان کا مفاد مغربی طاقتوں سے متحد ہے' اپنے اندر ان کی حمایت کے لیے کوئی جذبہ نہیں پاتے۔ بلکہ ان کے دلوں میں کمیونسٹ بلاک سے کچھ کم نفرت مغربی بلاک کے لیے نہیں ہے۔

مسلمان یہ سوچتے ہیں کہ ہم آخر کمیونسٹ بلاک کے مقابلے میں مغربی بلاک کا ساتھ کیوں دیں ؟ اگر ہماری عزیز اور محبوب قدریں دونوں کے ہاتھوں سے یکساں طور پر پامال ہوتی ہیں' تو ہمارے عمل میں ایک کے مقابلے میں دوسرے کے لیے ہمدردی پیدا ہونے کی کیا معقول وجہ ہے۔ ایک قوم کے خواص تو اپنے مخصوص مفادات کے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک قوم کے عوام میں لڑنے کا جذبہ صرف اسی حالت میں ابھرتا ہے جب کہ وہ اپنی عزیز و محبوب چیزوں کو خطرے میں دیکھتے ہیں اور ان کو بچانے کے لیے اٹھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ مسلمان بہرحال مغربی ممالک کے لیے کرائے کے سپاہی نہیں بن سکتے کہ محض مالی امداد لے کر وہ ان کی خاطر کمیونسٹ بلاک سے لڑیں۔ وہ اگر سچے جذبے کے ساتھ لڑ سکتے ہیں تو صرف اپنی تہذیب اپنے تمدن اور اپنے عقائد و نظریات کو بچانے کے لیے لڑ سکتے ہیں۔ اگر اسی چیز کو مغربی طاقتیں اپنی مداخلت یا ریشہ دوانیوں سے مسلمان ممالک میں پامال کرا دیں تو پھر انہیں مسلمان قوموں سے کسی تائید کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ نوری السعید اور چیانگ کائی شیک کی قسم کے لوگ مختلف مسلمان ملکوں میں کھڑے کر کے وہ کچھ دنوں ان سے فائدہ اٹھاتی رہیں۔

بہرحال یہ تیسری مزاحمت مسلمان ممالک میں اسلام کا احیاء چاہنے والوں کے لیے ایک بہت بڑا دردسری ہوئی ہے۔ جس کو بھی اس مقصد کے لیے ان ملکوں میں کام کرنا ہو' وہ اس کی طرف سے آنکھیں بند کر سکتا۔ اس کو اپنے حساب میں رکھ کر ہی اسے اپنا پروگرام بنانا ہو گا۔

آپ کے خیال میں گزشتہ بارہ سال میں پاکستان اسلامی نظریہ سے قریب آیا ہے یا اس سے دور ہٹا ہے؟

قریب بھی آیا ہے اور دور بھی ہٹا ہے۔

قریب اس لحاظ سے آیا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک اسلامی نظام کے حق میں مسلسل اتنا کام اتنے وسیع پیمانے پر ہوا ہے نہ اس سے پہلے اس ملک میں کبھی ہوا تھا اور نہ کسی دوسرے مسلمان ملک میں اس کی کوئی نظیر پائی جاتی ہے۔ اس کام کی وجہ سے ایک طرف علمی حیثیت سے اسلامی نظام کے تمام گوشے اچھی طرح روشنی میں آ گئے ہیں' اور اب ساون کے چند اندھوں کو چھوڑ کر اس ملک میں ایماندار اہل علم واصحاب فکر میں کوئی ایسا نہیں رہا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ "اسلامی نظام" کوئی مبہم سا تخیل ہے جس کا نقشہ ہمارے سامنے واضح نہیں ہے۔ دوسری طرف عوام کے اندر اس مسئلے پر اتنی بیداری پیدا ہو چکی ہے اور اس کے حق میں ایسی مضبوط رائے عام تیار ہو گئی ہے' کہ اب کسی میں یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ کھل کر اس ملک میں لادینی نظام لانے کا ارادہ ظاہر کر سکے۔

اس کے علاوہ دو چیزیں اور بھی ہیں جنہوں نے اسلامی نظریہ کے لیے یہاں راہ ہموار کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ ایک یہ کہ بے شمار مذہبی اختلافات کے باوجود تمام اہل دین شروع سے اب تک اسلامی نظام کے مطالبے اور اس کی اصولی صورت کے بارے میں پوری طرح متفق رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ' لادینی کے حامی مغربیت زدہ طبقے کے ہر عنصر کو پچھلے --- سالوں میں یہاں اپنا امتحان دینے کا پورا موقع مل چکا ہے۔ اور انہوں نے اپنا ایسا براحساب ساری قوم کے سامنے پیش کیا ہے کہ ان کی کوئی اخلاقی ساکھ اب باقی نہیں رہی ہے۔ حقیقتہ" قوم اب ان سے پوری طرح مایوس ہو چکی ہے' اور ان کے اندر اب کوئی عنصر ایسا نہیں رہ گیا جس کو آزمائش کا موقع دینے کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہو۔

دور اس لحاظ سے ہوا ہے کہ اس تیرہ سال میں برسر اقتدار مغرب پرست طبقے کی مختلف تدبیروں سے اور اس کے بیرونی حامیوں کی مالی امداد اور قومی ترقی کے پروگراموں سے قوم کے اخلاق میں اتنا بگاڑ رونما ہو چکا ہے جتنا آزادی سے پہلے غلامی کی پوری ڈیڑھ صدی میں بھی نہیں ہو سکا تھا۔ تعلیم و تربیت کا ناقص نظام نئی نسل کا ستیاناس کر چکا ہے' اور کرتا چلا جا رہا ہے "ثقافت" کے نئے رنگ ڈھنگ اور اس کے ساتھ ریڈیو سینما اور فحش لٹریچر اونچے طبقوں سے لے کر دیہاتی عوام تک کو رنگیلا اور عیاش اور جرائم پیشہ بنانے میں شب و روز سرگرم ہیں' اور ان کی بدولت اخلاقی پستی کا زہر قوم کی رگ رگ میں اتر گیا ہے۔

اونچے طبقوں کی بدترین مثالوں سے متاثر ہو کر عورتوں میں بے پردگی بڑھ رہی ہے۔

مردوزن کے اختلاط میں اضافہ ہو رہا ہے' بے حیائی کے مظاہروں کا ایک سیلاب امڈا چلا آ رہا ہے۔ ان سب اسباب کے ساتھ مل جل کر ضبط ولادت کی تحریک وہ خطرناک خدمت انجام دے رہی ہے جو ہماری آبادی میں زنا اور اس کے قدرتی نتائج کو نقطہ عروج پر پہنچا دے گی' اور ہمارے عائلی نظام کی جڑیں ہلا ڈالے گی۔

پھر ہمارے سرکاری افسروں اور ملازموں میں' تاجروں اور صنعت کاروں میں' اور دوسرے طبقات میں حرام خوری خیانت فرض ناشناسی اور آئین و قانون کی بے احترامی ایک وبا کی صورت اختیار کر چکی ہے' جسے روکنے کی ہر تدبیر مرض میں مزید اضافے ہی کی موجب ثابت ہوئی ہے۔

یہ حالات' ظاہر ہے کہ اسلامی نظریہ کے مطابق اصلاح کو روز بروز مشکل سے مشکل تر کرتے چلے جا رہے ہیں۔

آپ کے نزدیک اسلامی نظریہ کو عملاً بروئے کار لانے کے لیے کون سے اقدامات ہیں۔ سیاسی اور تہذیبی زندگی پر اس نظریہ کے کیا اثرات مرتب ہونے چاہیں:

سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ تو اس ملک میں جمہوریت کی بحالی ہے۔ اس لئے کہ اگر اس ملک کی حیثیت اس گھوڑے کی سی ہو جس کے منہ میں لگام ڈال کر ہر طاقت ور شخص اس پر زبردستی سوار ہو جائے اور اسے اپنے راستے پر چلانا شروع کر دے' تو ایسی حالت میں گھوڑے غریب کے لیے یہ سوچنا ہی لاحاصل ہے کہ وہ کدھر جانا چاہتا ہے' اور اپنی مرضی کے راستہ پر جانے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے۔ ہمیں سب سے پہلے اس حالت کو بدلنا چاہیے۔

ہم کو یہاں ایک آزادانہ جمہوری ماحول درکار ہے جس میں اظہار خیال اجتماعی تنظیم اور سعی و جہد کی آزادی ہو' جس میں ہر شخص اپنے خیالات کے مطابق رائے عام کو ہموار کرنے کی کوشش کر سکے' جس میں رائے عام کو کسی نظریہ کے حق میں ہموار ہو جانا ہی اس نظریے کے مطابق قیادت میں تبدیلی ہو جانے کے لیے کافی ہو' اور جس میں قیادت کی تبدیلی کے لیے ایک پر امن آئینی راستہ موجود ہو۔ ایسے ماحول میں تو یہ ممکن ہے' میں اپنے نظریے کو بروئے کار لانے کے لیے کچھ اقدامات سوچ سکوں انہیں بیان کر سکوں' لوگ ان کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں' اور جن کے نزدیک وہ صحیح ہوں' وہ میرے ساتھ مل کر عملاً ان اقدامات کے لیے کوشش کر سکیں۔ لیکن اگر یہ ماحول موجود نہ ہو تو میرا اور آپ کا کسی قسم کے اقدامات کو سوچنا بے کار ہے۔ پھر تو سوچنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جو گھوڑے پر سوار ہونے کی طاقت رکھتے ہوں۔

یہ لازمی اور ابتدائی شرط پوری ہونے کے بعد' جو اقدامات اس نظریے کو بروئے کار لانے کے لیے درکار ہیں وہ تین بڑے بڑے شعبوں پر مشتمل ہونے چاہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں اس مقصد کے لیے بیک وقت تین سمتوں میں متوازن طریقے سے کوشش کی جانی چاہیے۔

ایک' تبلیغ و تعلیم اور تعمیر فکر۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کی آبادی کو وسیع اور عمیق پیمانے پر اسلام کے عقائد' اصول' احکام اور اخلاقی و عملی تقاضوں سے آگاہ کریں۔ غیر اسلامی نظریات وافکار اور نظام زندگی کے جو اثرات ان کے ذہن میں تھوڑے یا بہت اتر گئے ہیں ان کو صاف کریں۔ مختلف ذہنی طبقات کو ان کی استعداد کے مطابق یہ سمجھائیں کہ اسلام کے مطابق ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل کس طرح ہونی چاہیے اور مختلف مسائل حیات کو کیسے حل کرنا چاہیے۔

دوسرے' اصلاح اخلاق۔ یعنی لوگوں کی عملی زندگی کو اسلام کے تقاضوں کے مطابق درست کرنا اور ان غیر اسلامی اثرات کو عملاً ان کی زندگی سے خارج کرنا جو جہالت و جاہلیت کی وجہ سے یا قدیم غیر اسلامی تقالید کے باعث یا مغربی تہذیب و تمدن کی بدولت ان کے اندر پھیلے ہوئے ہیں۔

تیسرے' نظام حکومت کی اصلاح ۔ تاکہ حکومت کے ذرائع و وسائل اور اس کے قوانین اور اس کے انتظامی اختیارات اسلام کے مطابق ہماری زندگی کی تعمیر نو میں استعمال ہو سکیں' اور بالآخر ہم دنیا میں اس مشن کو پورا کرنے کے قابل ہو جائیں جو ایک امت مسلمہ ہونے کی حیثیت سے خدا نے ہمارے سپرد کیا ہے۔

ان تینوں شعبوں میں جس نوعیت کا کام درکار ہے اس پر غور کرنے سے خودبخود آپ ایک چوتھی چیز کی ضرورت بھی محسوس کرلیں گے جس کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک گروہ ہمارے اندر ایسا ہو جو اس کام کو انجام دینے کے لیے مخلص 'صحیح الفکر اور صالح العمل کارکنوں پر مشتمل ہو' وہ منظم طریقے سے اس مقصد کے لیے سعی و جہد کرے' وہ خود اپنے کارکنوں کی اصلاح و تربیت کی طرف بھی متوجہ رہے' اور کام کی وسعت کے ساتھ ساتھ مزید کارکن بھی پیدا کرتا رہے۔(چراغ راہ کراچی'نظریہ پاکستان نمبر)

فرد اور جماعت

جن لوگوں نے قرآن اور حدیث کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں اصل اہمیت فرد کی ہے نہ کہ جماعت یا اجتماعی نظام کی۔ ہر ہر فرد انسانی کو اللہ تعالٰی نے شخصیت عطا کی ہے' خودی کا احساس دیا ہے' انفرادی خصوصیات بخشی ہیں' دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں۔ سننے کے لیے کان دیئے ہیں' سوچنے' سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے لیے دل دیا ہے' خواہش' تمیز' ارادے اور فیصلے کی قوتیں دی ہیں' اور اپنی ملکیت میں سے بہت سی چیزیں امانۃً اس کے سپرد کر کے ان پر تصرف کے اختیارات اسے عطا کیے ہیں۔ اس بنا پر ایک ایک انسان منفرداً اللہ کا خلیفہ ہے اور یہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ یہی بات ہے جسے قرآن بار بار دہراتا ہے۔ کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا كَسَبَتۡ رَهِينَةٌ ۔ كُلُّ امۡرِیٍٕۭ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ ۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ۔ لَيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَعَلَيۡهَا مَا اكۡتَسَبَتۡ ' یہ سب اسی حقیقت کے اعلانات ہیں۔ اور اسی کو اس مشہور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ ۔ پھر اسی بات کو قرآن آخرت کے ذکر میں بکثرت بیان کرتا ہے کہ اللہ کی عدالت میں ایک ایک انسان انفرادی حیثیت سے اپنا حساب دے گا اور جو کچھ برائی یا بھلائی اس نے دنیا کی زندگی میں کمائی تھی' اس کا نتیجہ دیکھے گا۔ یعنی جس طرح شخصیت انفرادی ہے اور ذمہ داری انفرادی ہے اس طرح نتیجہ وانجام بھی آخرکار انفرادی ہی ہے اور اس نتیجہ و انجام کے خوب یا زشت ہونے اور خوبی وزشتی کے مختلف مدارج میں سے کسی درجہ پر پہنچنے کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس نے دنیا کی زندگی میں کس قسم کی شخصیت اپنے اندر پرورش کی' کن صفات کا اکتساب کیا' کس طرح ان قوتوں سے کام لیا جو اللہ نے اسے دی تھیں' کس طرح اس امانت میں اپنے اختیارات استعمال کیے' جو اللہ تعالٰی نے اسے سونپی تھی' اور اپنی تکمیل کے لیے ان ذرائع سے

کوں تک فائدہ اٹھایا جو اسے حاصل تھے۔

پس یہ حقیقت ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل بجائے خود مطلوب ہے۔ دین کا مخاطب فرد ہے' خدا کی عبدیت اور اطاعت کی طرف فرد کو دعوت دی گئی ہے' حقوق اور فرائض فرد پر عائد کیے گئے ہیں' امرونہی کے احکام فرد کو دیے گئے ہیں' طاعت پر جزا کی امید فرد کو دلائی گئی ہے اور عصیان پر سزا کی دھمکی بھی فرد ہی کو دی گئی ہے۔ اس نظام فکروعمل میں فرد ہی وہ اصل اکائی ہے جس کو ابتدا میں عامل کی حیثیت سے اور انتہا میں نتیجہ عمل پانے والے کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی کی عقل اور جذبات سے یہ اپیل کرتا ہے' اسی کو اپنی ہدایت و رہنمائی کا مخاطب بناتا ہے' اسی کی فلاح کا طالب ہے اور اسی کو خسران سے بچانا چاہتا ہے۔ اگر فرد اپنی جگہ ناقص رہ جائے اور اپنی شخصیت کو پستی میں گرادے تو آخری فیصلہ میں اس جماعت اور اجتماعی نظام کی خوبی اس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتی جس سے وہ دنیا میں تعلق رکھتا تھا' بلکہ اگر وہ کسی اچھی جماعت اور صالح اجتماعی نظام سے وابستہ تھا اور پھر اس نے اپنی تکمیل ذات اور ارتقاء شخصیت کے ان مواقع سے فائدہ نہ اٹھایا جو اسے حاصل تھے تو یہ چیز اس کے خلاف ایک اور قوی دلیل بن جائے گی اور اسے اور زیادہ خسران میں مبتلا کرے گی۔ بخلاف اس کے اگر وہ اپنی کوشش سے اس کمال کو پہنچ جائے جس کو وہ پہنچ سکتا تھا اور اپنی شخصیت کو اتنا بہتر نشوونما دے جتنا وہ دے سکتا تھا' تو جماعت اور اجتماعی نظام کا فساد اس کی فلاح و نجات میں مانع نہیں ہو سکتا' بلکہ یہ چیز اس کے حق میں ایک دلیل ہو گی کہ اس نے ناموافق حالات میں ترقی کے لیے اتنی کامیاب جدوجہد کی۔ یہی معنی ہیں اس آیت کے جو سورۃ مائدہ میں ارشاد ہوئی ہے کہ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ اور اس کے برعکس کی صحت پر خود اسی آیت کا مضمون دلالت کرتا ہے یعنی یہ کہ لا ینفعکم من اھتدی اذا ضللتم۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جماعت اور اجتماعی نظام کی صلاح' اسلام کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ فی الواقع اس کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ بجائے خود مطلوب ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے کہ فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل جماعت ہی کی اصلاح اور اجتماعی نظام ہی کی بہتری پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کو فرد فرد کی صورت میں پیدا تو ضرور کیا ہے' مگر فرد فرد کی صورت میں رکھا نہیں ہے۔ ہر شخص اس اجتماعی عمل کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے جو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان واقع ہوا تھا۔ پیدا ہونے

سے پہلے ہی اجتماعی زندگی کے بہت سے وہ ثمرات جو اس کی ماں اور اس کے باپ نے اپنے اندر جذب کیے تھے' موروثی صفات و خصائص کی صورت میں اس کے اندر پیوست ہو چکے ہوتے ہیں۔ اور وہ اس کی شخصیت کے نشوونما پر اچھا خاصا اثر ڈالتے ہیں۔ ماں کے پیٹ سے باہر آتے ہی وہ ایک جماعت کے درمیان آنکھ کھولتا ہے اور اجتماعی زندگی اس ساعت سے لے کر موت کی گھڑی تک پیہم اس پر اثر ڈالتی ہے اور اس سے اثر قبول کرتی رہتی ہے۔ اگر اجتماعی ماحول کسی غلط نظام پر قائم ہو' اس کی آب و ہوا صلاح کی بجائے فساد کو پرورش کرنے والی ہو' اس کی زمین خیر کے بجائے شر کے لیے سازگار ہو تو ان حالات میں اکثر و بیشتر افراد کی تکمیل ذات' دشوار بلکہ محال ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات اس ماحول میں وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے جسے دیکھ کر جلیل القدر پیغمبر پکار اٹھتا ہے کہ **رب لا تذر علی الارض من الکفرین دیارا انک ان تذرھم یضلوا عبادک ولا یلدوا الا فاجرا کفارا** ۔ اس لیے یہ ناگزیر ہے کہ جماعت کو درست اور اجتماعی نظام کو پاک کیا جائے' تاکہ بیشتر انسانی افراد کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو' جس میں ان کی شخصیتیں صحیح نشوونما پا سکیں۔ حرام کی روٹی' جس سے پرورش پائے ہوئے گوشت پوست کے لیے جنت حرام ہے اور جس کے حق میں نبی صادق و مصدق نے خبر دی ہے کہ آتش دوزخ ہی اس کے لیے اولیٰ ہے' آخر کوئی فرد اس سے کیونکر بچے اور رزق حلال کہاں پائے' جب کہ ایک غلط نظام معیشت نے رزق کے سارے چشموں کو گندہ کر دیا ہو؟ جاہلیت کے اخلاق' افکار اور اعمال جو انسان کے لیے ابدی خسران کے موجب ہیں' آخر کوئی شخص ان سے کس طرح محفوظ رہے' جب کہ تمدن' معاشرت تعلیم' سب پر جاہلیت پورے زور کے ساتھ چھائی ہوئی ہو اور اس کا زہر وبائی سمیت کی طرح سارے اجتماعی ماحول میں سرایت کر گیا ہو' معصیت خدا و رسول جس کے ساتھ کسی کمال کے حصول اور کسی شخصیت کے ارتقاء کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے آخر کوئی شخص اس سے کہاں تک پرہیز کر سکتا ہے' جب کہ ایک کافرانہ نظام سیاست نے کامل تسلط حاصل کر کے پوری پوری قوم کو کفر اور ظلم اور فساد کی خدمت پر مجبور کر دیا ہو؟ پس فرد کی نجات و فلاح بہت مشکل بلکہ محال ہے' اگر اس کی ترقی اور تکمیل کے راستے سے ان موانع کو دور نہ کیا جائے جو ایک بگڑی ہوئی جماعت اور ایک فاسد نظام اجتماعی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں' اور ایک ایسا صالح اجتماعی نظام نہ قائم کر دیا جائے جو اس تکمیل اور ترقی میں مددگار ہو۔

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہے۔ اور اسی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ترقی

اور تکمیل کا راستہ ہی اجتماعی زندگی کے اندر رکھا ہے' نہ کہ اس کے باہر۔ فرد کی وہ امتحان گاہ جس میں اُسے اپنی لیاقت یا نالائقی ثابت کرنی ہے اور جس میں کامیابی یا ناکامی ہی پر آخرت میں اس کی فلاح و خسران کا مدار ہے' کسی خلوت کدے یا کسی سنسان جنگل میں واقع نہیں ہے۔ بلکہ حیات اجتماعی کے عین منجدھار میں واقع ہے۔ اس کو اکیلا نہیں رکھا گیا ہے بلکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ بے شمار تعلقات کے رشتوں میں باندھ دیا گیا ہے۔ وہ کسی کا بیٹا' کسی کا بھائی' کسی کا شوہر' کسی کا باپ' کسی کا دوست' کسی کا دشمن' کسی کا ہمسایہ' کسی کا اجیر' کسی کا مستاجر' کسی کا حاکم' کسی کا محکوم کسی کا بائع' کسی کا مشتری' کسی کا امین' کسی کا موتمن بنایا گیا ہے۔ اور اس کا امتحان ہی اس امر میں ہے کہ ان تعلقات میں بندھ کر' ذمہ داریوں اور امانتوں کے بوجھ سے لد کر' خوف اور لالچ محبت اور غضب' امیدوں اور مایوسیوں کے ماحول میں رہ کر وہ کس طرح اللہ کے عائد کردہ حقوق اور فرائض ادا کرتا ہے' کس طرح اس کے مقرر کردہ حدود پر قائم رہتا ہے' کس طرح خلافت کے اس منصب سے عہدہ برا ہوتا ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ کن صفات کا اکتساب کرتا ہے' کن خصوصیات کو اپنے اندر نشونما دیتا ہے اور اپنی سیرت و کردار کے کیسے نقوش دنیا میں چھوڑ کر جاتا ہے۔ نیکی کا جو تصور اسلام پیش کرتا ہے وہ ہر معنی سے خالی ہو جاتا ہے اگر فرد کو اجتماعی زندگی سے الگ کر لیا جائے۔ جس شخص نے تمدنی تعلقات کے جتنے کم شعبوں میں قدم رکھا ہے اور جتنی کم ذمہ داریاں لی ہیں' اس نے گویا اس قدر کم پرچوں میں امتحان دیا ہے اور اس لحاظ سے اپنی شخصیت کو اتنے ہی پہلوؤں میں تکمیل کے مواقع سے محروم کر لیا ہے۔ حتیٰ کہ جس نے خلوت میں رہبانیت کی زندگی گزاری اس نے اپنے امتحان کے اکثر و بیشتر پرچے سادہ اوراق کی صورت میں بھیج دیئے' جن پر وہ سرے سے کوئی نمبر پانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔

قارئین ترجمان القرآن سے التماس ہے کہ ماہنامہ ترجمان القرآن کی توسیع اشاعت کے لیے چلائی جانے والی مہم میں ہمارے ساتھ بھرپور تعاون فرمائیں۔ اس سلسلہ میں اس پرچے کے ساتھ ایک خریدار کارڈ منسلک کیا گیا ہے' جس پر پاکستان میں ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ سالانہ خریداری پر آمادہ احباب سے یہ کارڈ پر کروا کر حوالہ ڈاک فرمائیں۔ مزید کارڈ بھی طلب کریں۔ (ادارہ)

قرآن کا نظریۂ کائنات

ڈاکٹر عبدالمغنی

(دوسری اور آخری قسط)

قرآن کا نظریۂ حیات

نظریہ کائنات کی تشریح کے ساتھ ساتھ نظریہ حیات کی وضاحت بھی ضروری ہے اُس لیے کہ اول تو کائنات خود ایک مظہر حیات (Phenemenon of Life) ہے' دوسرے کائنات بے حیات نہیں ہوسکتی اور کائنات کے اندر حیات کا وجود لازماً ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ خود قرآن نے زمین و آسمان کے ترکیب کے اجزائے ترکیبی کو ایک دوسرے سے جدا کرکے تخلیق کائنات کے آغاز کی جو نشان دہی ایک آیت میں کی ہے' جس کا حوالہ دیا جاچکا ہے' اس میں یہ صراحت بھی کردی ہے کہ خدا نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا' یعنی کائنات کے وجود میں آنے کے ساتھ ساتھ حیات کا عمل بھی شروع ہوگیا۔ ایک دوسری آیت کے مطابق' جس کا حوالہ بھی دیا جاچکا ہے' زمین و آسمان کی تخلیق کے وقت عرش خداوندی کے کسی نوعیت کے پانی کی سطح پر ہونے سے بھی اشارہ ملتا ہے کہ حیات کے آثار کائنات کے ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔

لہٰذا دیکھنا چاہیے کہ کائنات میں حیات کے وجود کے متعلق قرآن کا نقطہ نظر کیا ہے؟ علمی حلقوں میں ایک مدت سے یہ بحث ہوتی رہی ہے کہ کائنات و حیات کا ارتقا (Evolution) ہوا ہے یا ان کی تخلیق (Creation)؟ جب سے ڈارون نے انیسویں صدی میں اصل الانواع (Origin of Species'1859) کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش کیا ہے سائنس دانوں کا موقف یہ ہوگیا ہے کہ کائنات و حیات کی تخلیق بہ یک دفعہ یا جستہ جستہ نہیں ہوئی ہے' بلکہ تمام موجودات کا مسلسل ارتقا اس طرح ہوا ہے کہ پیہم ایک چیز کے اندر سے دوسری بہتر چیز نکلتی چلی گئی ہے' گرچہ سائنس کے اس مادی و میکانکی نظریے میں سائنس دانوں نے خود ہی کچھ گم شدہ

کڑیوں کا اقرار کیا ہے اور سب سے بڑھ کر حل طلب بلکہ ناقابل حل سوال تو یہ ہے کہ وہ بنیادی مادہ کب' کہاں اور کیسے وجود میں آیا جس سے حیات و کائنات کا سلسلہ شروع ہوا؟

چونکہ سائنس اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے' لہٰذا اس کے لیے مذہب کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور اس سلسلے میں مذہبی نقطہ نظر کا بہترین ترجمان قرآن ہی ہے' جو اسلامی نظریہ کائنات و حیات کی بنیادی دستاویز ہے۔ قرآن کا موقف سمجھنے کے لیے سب سے پہلے حسب ذیل آیات پر ایک نظر ڈالنی چاہیے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (الحجر ۱۵: ۲۶)

(ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے بنایا)

اس آیت کا مفہوم بقول مولانا مودودی" یہ ہے:

"یہاں قرآن اس امر کی صاف تصریح کرتا ہے کہ انسان حیوانی منازل سے ترقی کرتا ہوا بشریت کے حدود میں نہیں آیا ہے' جیسا کہ نئے دور کے ڈارونیت سے متاثر مفسرین قرآن ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں' بلکہ اس کی تخلیق کی ابتدا براہ راست ارضی مادوں سے ہوئی ہے جن کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ خمیر اٹھی ہوئی مٹی کا ایک پُتلا بنایا گیا تھا جو بننے کے بعد خشک ہوا اور پھر اس کے اندر روح پھونکی گئی۔"

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (الحجر ۱۵: ۲۷)

(اور اس سے پہلے جنوں کو ہم آگ کی لپٹ سے پیدا کر چکے تھے)

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ○ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ○ (طٰہٰ ۲۰: ۵۳ - ۵۴)

(وہی جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھا دیا اور اس میں تمہارے چلنے کو راستے بنائے' اور اوپر سے پانی برسایا' پھر اس کے ذریعے سے مختلف اقسام کی پیداوار نکالی۔ کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کے لیے)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ

اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ (المومنون ۲۳ : ۱۲ - ۱۴)

(ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا' پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا' پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی' پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا' پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا' پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ' سب کاریگروں سے اچھا کاریگر)

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (الشعراء ۲۶ : ۷ - ۸)

(اور کیا انہوں نے کبھی زمین پر نگاہ ڈالی کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا کی ہیں ؟ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے' مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ (فاطر ۳۵ : ۲۷-۲۸)

(کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے اور پھر اس کے ذریعے سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی سفید' سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں)

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ؕ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (الزمر ۳۹ : ۶)

(اس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا' پھر وہی ہے جس نے اس جان سے اس کا جوڑا بنایا۔ اور اسی نے تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے۔ وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ جس کے یہ کام ہیں تمہارا رب ہے' بادشاہی اسی کی ہے' کوئی

معبود اس کے سوا نہیں ہے' پھر تم کدھر سے پھرائے جا رہے ہو ؟)

وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○ (الذاریات ۵۱ : ۴۹)

(اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں' شاید کہ تم اس سے سبق لو)

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ○ (الطور ۵۲ : ۳۵)

(کیا یہ کسی خالق کے بغیر خود پیدا ہوگئے ہیں ؟ یا یہ خود اپنے خالق ہیں ؟)

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ○ وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ○ (القمر ۵۴:۴۹-۵۰)

(ہم نے ہر چیز ایک تقدیر کے ساتھ پیدا کی ہے اور ہمارا حکم بس ایک ہی حکم ہوتا ہے اور پلک جھپکائے وہ عمل میں آجاتا ہے)

وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ○ (نوح ۷۱ : ۱۴)

(اور اس نے طرح طرح سے تمہیں بنایا ہے)

یعنی مولانا مودودیؒ کہتے ہیں' "تخلیق کے مختلف مدارج اور اطوار سے گزارتا ہوا تمہیں موجودہ حالت پر لایا ہے۔"

وَاللَّهُ أَنبَتَكُم مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ○ (نوح ۷۱ : ۱۷)

(اور اللہ نے زمین سے تم کو عجیب طرح اگایا)

اس پر مولانا مودودیؒ کا نوٹ ہے :

"یہاں زمین کے مادوں سے انسان کی پیدائش کو نباتات کے اگنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح کسی وقت اس کرے پر نباتات موجود نہ تھیں اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کو اگایا اسی طرح ایک وقت تھا جب روئے زمین پر انسان کا کوئی وجود نہ تھا' پھر اللہ تعالیٰ نے یہاں اس کی پود لگائی۔"

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا ○ (الدھر ۷۶ : ۱)

(کیا انسان پر لامتناہی زمانے کا ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب وہ قابل ذکر چیز نہ تھا؟)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ○ (التین ۹۵ : ۴)

(ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا)

مذکورہ بالا آیات کے اشارے سے واضح ہوتا ہے کہ زندگی سرراہے پڑی ہوئی کوئی خودکار چیز نہیں ہے' یہ باضابطہ پیدا کی گئی ہے اور کوئی اس کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس بات کا خالق نے خود دعویٰ کیا ہے اور تخلیق کی نسبت اپنی طرف کی ہے' اس لیے کہ وہی خدائے کائنات اور مالک

حیات ہے۔ اس نے کائنات کے ساتھ ساتھ حیات ایک اندازے اور منصوبے کے مطابق پیدا کی ہے۔ یہ اس کی بنائی ہوئی تقدیر ہے جس کے تحت ہر چیز بقدر ضرورت' پوری اہمیت کے ساتھ' پیدا کی گئی ہے۔ ہستی کا ایک نظام ہے جو قدرت الٰہی کے مرتب کیے ہوئے فطری ضابطوں پر مبنی ہے۔ وجود نرا وجود نہیں ہے' اس کے کچھ قواعد اور کچھ مقاصد ہیں۔ وجود کی بے شمار شکلیں ہیں جو ایک منطقی ربط کے ساتھ باہم مربوط ہیں۔

خدا کی اس تخلیق میں ایک حکیمانہ ارتقاء ہے۔ ساری مخلوقات بہ یک دفعہ نہیں پیدا کردی گئیں۔ وہ ایک تدریج و ترتیب کے ساتھ نمودار ہوئی ہیں۔ بنیادی اور اولیں مادے کی تشکیل کے بعد جس کی نوعیت خدا کے سوا کسی کو معلوم نہیں' تمام مخلوقات مشیت الٰہی کے مطابق یکے بعد دیگرے' الگ الگ' وجود میں لائی گئیں۔ آسمان اور زمین' ستارے اور سیارے ایک طویل مدت کے اندر رونما ہوئے۔ دنیا اپنے تمام آفاقی مظاہر کے ساتھ وجود میں آئی اور اس کی زمین پر پہلے جمادات' پھر نباتات' تب حیوانات اور سب سے آخر میں انسان کی پیدائش ہوئی' جس کی تخلیق کے عناصر ترکیبی میں دوسری مخلوقات کا حصہ معلوم ہوتا ہے' اس کے خمیر اور سانچے میں مٹی' پودے اور جانور سب کے اجزاء ہیں' جو وجود کے مختلف مراحل کی نشان دہی کرتے ہیں' مگر انسان کی ساخت اپنی مکمل شکل میں دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز اور بہترین ہے' اس لیے کہ خدا نے اسے ایک دوسری مخلوق ہی' قرآن کے لفظوں میں "خَلْقاً اٰخَرَ" بنایا ہے۔ یہ حقیقت ماں کے پیٹ میں باپ کے نطفے کی پرورش و پرداخت سے بھی عیاں ہے۔

مٹی کا پتلا خدا کے حکم سے تیار ہوا اور جب اس کی ایک شکل بن گئی تو خدا نے اس میں اپنی روح پھونک دی۔ اس کے بعد آدم یا آدمی کی جنس سے ہی اس کا جوڑا بنایا گیا' جس طرح کائنات کے اندر حیات کے دوسرے تمام مظاہر کے بھی جوڑے بحکم خداوندی بنے ہوئے ہیں۔ غور کیا جائے تو خود زمین و آسمان ایک جوڑے کی شکل میں باہم ملے ہوئے تھے' جس کے نتیجے میں وجود کا وہ عمل شروع ہوا جس کا علم انسان کو دیا گیا' جبکہ اس سے پہلے کی ہر بات صرف خدا کے علم میں ہے اور بعد کی ترقیات کے بھی بعض اسرار و رموز غیب ہی میں رکھے گئے ہیں۔ انسان کو صرف اس کی تخلیق اور حیات و کائنات کے چند اہم حقائق بتا کر یہ اعلان کردیا گیا ہے کہ خدا نے آدمی کو "بہترین سانچے" (احسن تقویم) میں پیدا کیا ہے۔

یہ اشارہ ہے اس نکتے کی طرف کہ انسان حیات کا عظیم ترین مظہر اور خدا کی بہترین مخلوق ہے جسے کائنات کے حقائق کا علم دے کر جنوں اور فرشتوں تک پر فضیلت دی گئی' تاکہ وہ دنیا میں

خدا کا نائب بن کر مشیت الٰہی کے منصوبوں کی تکمیل کرے اور ہستی کے اس امتحان میں کامیاب ہو کر بڑے سے بڑا انعام حاصل کر سکے' جیسا قرآن کی ان آیات سے واضح ہوتا ہے جن کا حوالہ آئندہ سطروں میں دیا جائے گا۔ یہ ہے اسلام کا نظریہ حیات جو قرآن سے عیاں ہے۔

منصوبۂ تخلیق

حیات و کائنات کے وجود کا تجسّس کرتے ہوئے ہر صاحب علم کو یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ زمین سے آسمان تک فطرت کے عظیم الشان نظام کا منصوبہ تخلیق کیا ہے ؟ اس اہم ترین سوال کا بہترین جواب وہی ہے جو خود خدا کے لفظوں میں قرآن مجید نے دیا ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل آیات پر اچھی طرح غور کیا جانا چاہیے :

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (الدخان ۴۴ : ۳۸ - ۳۹)

(یہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں۔ ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے' مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں)

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُ ○ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ○ (الملک ۶۷ : ۱ - ۲)

(نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے' اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی)

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (الجاثیہ ۴۵ : ۲۲)

(اللہ نے تو آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ہر متنفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے۔ لوگوں پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا)

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ○ (الجاثیہ ۴۵ : ۲۴)

(یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے' یہیں ہمیں مرنا اور جینا ہے اور گردش ایام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔ درحقیقت اس

معاملے میں ان کے پاس کوئی علم نہیں' یہ محض گمان کی بنا پر باتیں کرتے ہیں)

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ (البقرہ ۲ : ۲۱)

(لوگو' بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے' تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت میں ہو سکتی ہے)

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الروم ۳۰ : ۳۰)

(پس یک سو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو' قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے' اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی' یہی بالکل راست اور درست ہے' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاۗءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ (ص ۳۸ : ۲۷)

(ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور اس دنیا کو جو ان کے درمیان ہے فضول پیدا نہیں کر دیا ہے)

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً . . . وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا . . . وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ . . . (البقرہ ۲ : ۳۰ - ۳۴)

(پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں" انہوں نے عرض کیا : "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔" فرمایا : "میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے" اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے' پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا "اگر تمہارا خیال صحیح ہے کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ" انہوں نے عرض کیا "نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے' ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں" پھر اللہ نے آدم سے کہا "تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ"۔ جب اس نے ان کو ان سب کے نام بتا دیے تو اللہ نے فرمایا : "میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور

زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں' جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے بھی میں جانتا ہوں۔"

پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو سب جھک گئے' مگر ابلیس نے انکار کیا۔ وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا)

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط (الاعراف ۷ : ۵۴)

(خلق اور امر دونوں اسی کے ہیں)

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط (الاحزاب ۳۳ : ۷۲)

(ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے' مگر انسان نے اسے اٹھا لیا)

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حیات و کائنات کی تخلیق ایک منصوبے کے تحت' ایک مقصد کے لیے ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ خدا کی بندگی کرتے ہوئے انسان اپنی زندگی میں روئے زمین پر نیابت الٰہی کی امانت کا حق ادا کرے اور اس مقصد کے لیے جہاں ہر ہر فرد بہترین شعور و کردار کا ثبوت دے وہیں پوری نوع انسانی ہر سطح پر ہمہ جہت ترقی کرے' تاکہ عالم وجود کا ارتقا اس حد تک پہنچ جائے جو خدا نے مخلوقات کی ہستی کے لیے مقرر کر دی ہے۔ یہ فروغ ہستی عروج انسانیت بھی ہے۔ اسلام کی روایات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہونے والی روحانی و جسمانی معراج' جس کا بیان قرآن کی سورہ بنی اسرائیل اور سورہ نجم میں ہوا ہے' ایک مربوط و متوازن ارتقائے وجود کی وہ انتہا ہے جس کے آگے انسان کا تصور نہیں جاسکتا۔

خدا نے خلق اور امر دونوں کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے دنیا بنا کر چھوڑ نہیں دی ہے بلکہ جیسا قرآن کی متعدد آیتوں سے واضح ہوتا ہے تخلیق کائنات کے بعد بھی خالق کائنات اپنے کلی و عمومی آفاقی اقتدار کے عرش پر بیٹھا ہوا کارخانہ ہستی کا سارا نظام چلا رہا ہے۔ ازل سے وجود کی تقدیر اس نے بنائی ہے اور ابد تک وجود کے تمام امکانات کو روبہ عمل لانے کی تدبیر وہی کرتا رہے گا۔ وہ حیات و کائنات کی تمام شکلوں کا پروردگار (رب) ہے اور اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے کہ وہ تمام دائروں میں رونما ہونے والی زندگی کی ہدایت بھی کرتا رہے:

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ ۲۰ : ۵۰)

(ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی' پھر اس کو راستہ بتایا)

اس خیال انگیز آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ کہتے ہیں :

"یعنی دنیا کی ہر شے جیسی کچھ بھی بنی ہوئی ہے اس کے بنانے سے بنی ہے۔ پھر ایسا نہیں کیا کہ ہر چیز کو اس کی مخصوص بناوٹ دے کر یونہی چھوڑ دیا ہو بلکہ اس کے بعد وہی ان سب چیزوں کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے اپنی ساخت سے کام لینے اور اپنے مقصد تخلیق کو پورا کرنے کا طریقہ اس نے نہ سکھایا ہو۔ کان کو سننا اور آنکھ کو دیکھنا' مچھلی کو تیرنا اور چڑیا کو اڑنا اسی نے سکھایا ہے۔ وہ ہر چیز کا صرف خالق ہی نہیں' ہادی اور معلم بھی ہے۔"

مخلوقات کے اتنے زبردست' ہمہ گیر اور موثر انتظام کے بعد سب کو اشرف المخلوقات کے لیے مسخر کردیا گیا' تاکہ وہ سطح وجود یا روئے ارض پر خدائے کائنات کی نیابت کرتے ہوئے اپنی زندگی کا امتحان اپنی تمام قوتوں کے ساتھ دے اور خالق کے حضور میں سرخ رو ہوکر آخرت کی حیات ابدی کا سامان کرے۔ یہ امتحان میں کام یابی کا انعام ہوگا' جب کہ ناکامی کی سزا مکمل تباہی ہے۔

سائنس اور قرآن کے نظریات کا موازنہ

حیات و کائنات کی زندگی و ترقی کے متعلق سائنس اور کائنات کے نظریات کا جو مختصر بیان عمومی طور پر گزشتہ سطور میں کیا گیا ہے ان کا ایک تقابلی مطالعہ کرلینے سے اولین حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ سائنس اپنی محدود اور ناقص معلومات کی وجہ سے کوئی بات یقینی طور پر صاف صاف نہیں کہہ سکتی' جبکہ قرآن خدا کے بے پایاں اور کامل علم کی بنا پر ہر چیز بالکل قطعی طور پر صراحت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس کے بیانات سے وہ اعتماد نہیں پیدا ہوتا جو مثبت اور موثر عمل کا سرچشمہ ہے۔ اس کے برخلاف قرآن کے اشارات یقین و اعتماد کی کیفیت پیدا کرتے اور بہترین عمل کی تحریک کرسکتے ہیں۔ یہ فرق نہایت اہم ہے۔ انسان کی زندگی بے عمل فکر کی بنیاد پر نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ باقی رہ سکتی ہے۔ لہٰذا انسانیت کی بقا و ترقی کا تقاضا ہے کہ اس فکر کو اختیار کیا جائے جو نتیجہ خیز ہو' محض خرد کے بدلتے ہوئے نظریات کا کھیل نہیں ہو' زندگی کا ایک مستقل تصور ہو جو ایک مقصد حیات سے عشق اور اس کے لیے عمل کا جذبہ پیدا کرے۔

ارتقا کی گفتگو کرنے کے باوجود سائنس دانوں کے خیالات میں جمود کا ایک عنصر ہے اور وہ ان کی خدا بے زاری کا پیدا کیا ہوا ہے' جو صریحا بے عقلی کی ایک بے بنیاد بات ہے۔ اس کے

برخلاف قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک متحرک کائنات میں سانس لے رہے ہیں جو ہمہ دم ترقی کر رہی ہے۔ "کن فیکون" کی صورت میں خدا کی قدرت اور مشیت کا عمل مسلسل جاری ہے۔ خدا اول تو "بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (الانعام ۶:۱۰۱) یعنی آسمان و زمین کا موجد ہے' دوسرے وہ تخلیق کی ابتدا کے ساتھ اس کا اعادہ (يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ' یونس ۱۰:۳۴) کرنے والا بھی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ○ (الذاریات ۵۱: ۴۷)
(یعنی آسمان کو خدا نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور وہ کائنات میں مسلسل توسیع کر رہا ہے)

مزید ارشاد یہ ہے:

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (الاحقاف ۴۶: ۳۳)
(اور کیا ان لوگوں کو یہ سجھائی نہیں دیتا کہ جس خدا نے یہ زمین و آسمان پیدا کیے ہیں اور ان کو بناتے ہوئے وہ نہ تھکا وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ مردوں کو جلا اٹھائے' کیوں نہیں' یقیناً وہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے)

واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے بعد زندگی اور دنیا کے بعد آخرت کا تصور قرآن و اسلام کے نظریہ حیات و کائنات کے انتہائی متحرک ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے' جب کہ دنیا کی زندگی تک محدود سائنس دانوں کے افکار کی دہریت ان کے جمود فکر کی قطعی دلیل ہے۔

سائنس کے نظریہ حیات و کائنات میں ربط و تسلسل کی سخت کمی ہے۔ ارتقا کی گم شدہ کڑیاں تمام اہل علوم کو معلوم ہیں۔ یہ ایک ایسا میکانکی و حیوانی ارتقا ہے جس میں رخنے ہی رخنے ہیں' جن کو بھرنے کے لیے صرف مفروضے (Hypotheses) قائم کر لیے گئے ہیں اور ان پر اصول موضوعہ (Postulates) کی طرح یقین کیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف قرآنی نظریہ بالکل مربوط و مسلسل ہے اور مفروضوں کی بجائے قطعی بیانات پر مشتمل ہے۔ بلاشبہ ان بیانات کو عقاید (Dogmas) کا اظہار کہا جاسکتا ہے' لیکن یہ ایک فطری و منطقی صورت حال ہے' اس لیے کہ غیب کے متعلق مشاہدے اور تجربے کی بات نہیں کی جاسکتی' لا محالہ ایمانیات کی بات کی جائے گی۔ یہ بھی گرچہ اصول موضوعہ ہیں مگر یہ انسانی گمان و قیاس پر مبنی اور اس لیے مشتبہ نہیں' وحی کے خدائی الفاظ ہیں جن کی صداقت کی تردید کسی واضح دلیل سے نہیں کی جاسکتی۔

سائنس حیات کی ابتداء اور ایک مدت تک اس کے ارتقا کو ایک خود کار (Mechanical)

عمل مانتی ہے اور انسان کے اندر شعور کے آغاز سے پہلے حیوانی ادوار زندگی فرض کرتی ہے۔ اس کے برخلاف قرآن کا نظریہ ہے کہ ایک علیم و خبیر ہستی نے پوری حکمت کے ساتھ کائنات اور اس کی موجودات کی تخلیق کے ساتھ ساتھ حیات کو درجہ بہ درجہ ترقی دی' اس کے مختلف مرحلے اور دائرے متعین کیے' یہاں تک کہ مٹی کے پتلے میں اپنی روح پھونکنے کے فوراً بعد اسے علم و شعور کی دولت سے اس حد تک مالا مال کردیا کہ وہ مخلوقات میں سب سے افضل بن گیا اور فرشتے بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکے تو بحکم خداوندی اس کے آگے جھک گئے' چنانچہ خدا نے روئے زمین پر انسان کو اپنا نائب (Deputy) بنا کر کائنات کی تمام اشیا کو اس کی خدمت اور اس کے استعمال کے لیے مسخر کردیا۔ یہ جذباتی تصورات نہیں ہیں' دانش مندانہ افکار ہیں جن کی بنا پر اور جن کی بدولت ہی دنیا میں انسان کی زندگی کا کوئی مصرف و مقصد' معیار اور نصب العین معلوم ہوتا ہے' اس کی سنجیدگی اور ذمے داری واضح ہوتی ہے اور اس کی افادیت و اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

بہرحال قرآن سائنس کی کتاب نہیں ہے' یہ تو زندگی کا ہدایت نامہ ہے۔ لہٰذا قرآن سائنس کی طرح فارمولے نہیں پیش کرتا' نہ ہی حیات و کائنات کے ارتقا کے مراحل سے بحث کرتا ہے' اس کے بجائے وحی الٰہی صرف ان بنیادی امور پر روشنی ڈالتی ہے جن کا تعلق زندگی اور اس کے معاملات سے ہے۔ چنانچہ حیات و کائنات کی تخلیق و تشکیل اور توسیع و ترقی کے متعلق نازل ہونے والی آیات قرآنی کا مطلب و مقصد صرف یہ ہے کہ انسان اپنے ماحول کے حقائق کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لے اور اس سلسلے میں اس کا ذہن صحیح طور پر کام کرے' تاکہ دنیا میں انسان کا کردار درست رہے' وہ راہ راست پر چلے اور منزل مقصود کی طرف بڑھتے' یہی وجہ ہے کہ حیات و کائنات کے حقائق کی تفصیل میں جانے کے بجائے قرآن نے ان کی طرف اشارے کرنا کافی سمجھا ہے۔ کہنا چاہیے کہ قرآن نے آخری سوالات کے جواب دے کر ان مسائل کے حل کی شاہ کلید اہل ایمان کے حوالے کردی ہے جن میں اہل علم زمانہ دراز سے الجھے ہوئے ہیں۔ اب یہ صاحب ایمان سائنس دانوں کا کام ہے کہ وہ قرآنی اشارات کی روشنی میں لادین سائنس دانوں کے دہریت پسندانہ نظریات کی تردید اور قرآن کے پیش کیے ہوئے ایمان افروز تصورات کی تشریح و تصریح کریں۔

صحیح علمی رویہ

علم انسان کے وجود کا سب سے بڑا سرمایہ ہے' لیکن علم کے موضوعات بنیادی طور پر دو قسم کے ہیں' ایک وہ جو مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتے ہیں' دوسرے وہ جن کا انکشاف وحی

کے ذریعے معلوم ہوتا ہے۔ ابتداء و انتہاء کے متعلق جو سوالات انسان کے ذہن میں آتے ہیں' مثلاً

۱۔ ہستی کا سفر کب اور کیسے شروع ہوا؟

۲۔ اس سفر کی منزل کیا ہے؟

ان سوالوں کے جواب دینے سے انسان کا ذہن قاصر ہے۔ دوسرے سوال سے تو سائنس بحث ہی نہیں کرتی' مگر پہلے سوال پر جو کچھ تفتیش اور جستجو اب تک اس نے کی ہے اس کا کوئی حاصل نہیں نکلا' اس لیے کہ اس سوال کا تعلق غیب سے ہے اور غیب کا علم سوا خدا کے کسی کو نہیں ہے' اور انسان کو اتنا ہی معلوم ہے جتنا خدا نے بتا دیا ہے۔ لہٰذا یہ معاملہ اصلاً ایمان کا ہے جس پر انحصار کر کے ہی کوئی علمی کاوش نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ قرآن نے اس سلسلے میں صحیح علمی رویے کی نشاندہی خود ہی کر دی ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ؔۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○ (آل عمران ۳ : ۷)

(اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں : ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات۔ جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں' حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا' بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں کہ "ہمارا ان پر ایمان ہے' یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں۔" اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانش مند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں)

حیات و کائنات کی ابتدا کا تعلق متشابہات سے ہے' اس لیے کہ یہ موضوع بہت مبہم ہے اور اس میں مختلف بلکہ متضاد نظریات کے امکانات ہیں' جن کے سبب انتشار فکر پیدا ہوتا ہے اور تعین کے ساتھ کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کہ حقیقت کیا ہے' لہٰذا انسان اپنی عقل سے قیاس پر قیاس کرتا چلا جاتا ہے اور اس کے نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ اس ذہنی پراگندگی کا اثر عملاً انسان کی زندگی پر پڑتا ہے اور اس کے شعور و کردار دونوں میں کجی پیدا ہو جاتی ہے' بسا اوقات وہ الحاد کی

طرف مائل ہو جاتا ہے اور ایک نامراد زندگی گزارتا ہے' یہ سب ذہنی عدم توازن کے سبب ہوتا ہے۔ قرآن کی حسب ذیل آیت بگڑے ہوئے توازن کو درست بھی کر سکتی ہے اور ذہن کو متوازن بھی رکھ سکتی ہے:

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○
(المومن ۴۰: ۵۷)

(آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسان کو پیدا کرنے کی بہ نسبت یقیناً زیادہ بڑا کام ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں)

اس آیت سے انسان کے ذہن کی حد معلوم ہوتی ہے۔ زمین و آسمان کی وسعت کے مقابلے میں آدمی کی قوتوں کا پیمانہ مختصر ہے۔ لہٰذا اگر وہ عقل سلیم سے کام لے تو اپنے محدود علم پر ناز کرنے کے بجائے ان باتوں کا علم جن کا سمجھنا اس کے لیے محال ہے خدا سے طلب کرے اور اس کے لبوں پر یہ دعا ہو:

رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ○ (طہ ۲۰: ۱۱۴)
(اے پروردگار مجھے مزید علم عطا کر)

یہ درحقیقت اس حکمت کی طلب ہوگی جسے قرآن مجید نے "خیر کثیر" قرار دیا ہے:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرہ ۲: ۲۶۹)

(جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی)

علم و حکمت کی جستجو قرآن حکیم کا ایک اہم موضوع ہے اور اللہ کی کتاب نے بار بار انسان کو فطرت کے تمام داخلی و خارجی مظاہر پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ ان مظاہر کو خدا نے اپنی قدرت کی نشانیوں سے تعبیر کیا ہے اور ان کا نام آیات رکھا ہے۔ کائنات میں ہر طرف خدا کی آیات پھیلی ہوئی ہیں اور پیہم ان آیات کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا دیدہ وری کا تقاضا ہے کہ ہدایت الٰہی کے تحت ان آیات پر تدبر کرکے ایسی تدبیروں سے کام لیا جائے جو حق و صداقت کو واضح کردیں۔ آدمی کو جو قوتیں فطری طور پر دی گئی ہیں انکا صحیح مصرف یہی ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ○ (حم السجدہ ۴۱: ۵۳)

(عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں

بقیہ صفحہ ۵۶ پر

اسلامی تحریک نئے مراحل میں

نعیم صدیقی

جب "تحریکیت" کے بجائے اسلام میں جامد مذہبیت کے انداز پیدا کر دیئے گئے تو پھر دین کی دعوت، دینی نظم جماعت، دینی تحریک، دینی مقاصد، دینی طریق کار وغیرہ کے مفہوم میں بھی جمود سرایت کر گیا، اور دینداری اور جمود باہم لازم و ملزوم ہو گئے۔ جن حضرات نے ایک طویل محنت کے بعد یہ صورت حالات پیدا کی ہے، ان کے سامنے اسلام کا ایک ایسی تحریک بن کر ابھرنا جو قوت کا باگ دوڑ سنبھال کر زندگی کی ساری کارگاہ کو نئے انداز سے منظم کرنا چاہتی ہے، ایک ایسی انوکھی صورت حال ہے، جس سے وہ خواہ مخواہ اپراتے ہیں، اور انہیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ حرکت و عمل کا یہ سارا طوفان ایک ہنگامہ دنیویت ہے، اس میں دین کی اصل روح کارفرما ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اس نشوونما پاتی ہوئی تحریک پر جب نگاہ ڈالتے ہیں تو اپنی آنکھوں پر ان ہی چند خاص اصطلاحات کی رنگیں عینکیں لگا کر اس کا تجزیہ کرتے ہیں جو جامد مذہبیت کے تنگ تصورات کی حامل ہیں۔ ان تنگ تصورات کے تنگ پیمانوں سے جب وہ جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کو ماپنا چاہتے ہیں تو یہ پیمانے چھلک جاتے ہیں اور وہ زبان حال سے یہ کہتے ہیں :۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

پس ان کے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کے مخصوص دینی پیمانوں سے جس دین داری کو نہیں ناپا جا سکتا، وہ بھی مستند دینداری ہو سکتی ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک جو کچھ جامد مذہبیت کے پیمانوں سے چھلک کے باہر گر جائے اسے لازماً دنیویت ہونا چاہیے۔

اس طرح کے محدود ذہنی تصورات کو ذہنوں میں جگہ دے کر یہ سمجھنا آدمی کے لیے ممکن نہیں رہتا کہ ایک نشوونما پاتی ہوئی تحریک کس طرح چلا کرتی ہے، اسے ہر ہر قدم پر کس طرح نوبہ نو مراحل پیش آتے ہیں، اور وہ انہیں کن کن طریقوں سے حل کرتی ہوئی آگے بڑھا کرتی

ہے۔ اگر جامد مذہبیت کی بنیادی گرہ کھل جائے تو پھر باقی ساری گرہیں خود بخود کھل سکتی ہیں۔ اسلام کے تحریکی مزاج کو اگر سمجھ لیا جائے تو پھر اس حقیقت کا فہم کچھ بھی مشکل نہیں رہتا کہ دین کی علمبرداری کرنے والے کسی کارواں کا راستہ کن کن وادیوں سے ہوتا ہوا اور کون کون سے موڑ مڑتا ہوا آخری نصب العین تک پہنچتا ہے۔ لہٰذا اب ضروری ہے کہ ہمارے دینی حلقوں کے حضرات اسلام کی راہ عمل اور اس کے مراحل کار کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی تحریکی فطرت کو پیش نظر رکھیں۔

جامد مذہبیت نے دعوت دین کی اصطلاح کو مروجہ تبلیغ کا محدود مفہوم دے کر جس سطح پر گرا دیا ہے' وہ اسلام کے تصور دعوت و تبلیغ سے بہت ہی پست ہے۔ بخلاف اس کے جماعت اسلامی "دعوت" کی اصطلاح کو اس کے جامع مفہوم کے ساتھ اپنے پیش نظر رکھتی ہے۔ ہمارے سامنے صرف چند مابعدالطبیعی عقائد اور فقہی جزئیات پر وعظ کہنے' اور انفرادی گفتگوئیں کر لینے کا پروگرام نہیں ہے' بلکہ ہماری دعوت اقامت دین کی دعوت ہے۔ ہم ایک غلط نظام زندگی کو اسلامی نظام زندگی میں بدلنے کے داعی ہیں۔ ہماری دعوت کا خطاب صرف افراد ہی سے نہیں' بلکہ معاشرے کے مجموعی وجود اور تمدن و سیاست کے ہمہ گیر اداروں سے بھی ہے۔ اس طرح کی وسیع عملی دعوت کے تقاضے وعظ گوئی سے پورے نہیں ہو سکتے' بلکہ یہ دعوت اذان سے رجز تک کے سارے مراحل کو محیط ہے۔ یہ دعوت صرف لفظوں ہی سے نہیں دی جا سکتی' بلکہ اس کی صداقت کی گواہی عمل و کردار کے مظاہرے سے دینی ناگزیر ہوتی ہے۔ پھر یہ دعوت منتشر افراد کے ذریعے اپنے مقاصد کو نہیں پہنچ سکتی' بلکہ یہ اپنی فطرت کے اعتبار سے نظم جماعت کی متقاضی ہے۔ کبھی یہ دعوت ناصحانہ پیرائے میں دینی پڑتی ہے' اور کسی موقع پر ناقدانہ پیرائے میں۔ کبھی اس کے لیے نرم سے نرم انداز ڈھونڈ کے لانا پڑتا ہے' اور کبھی یہ تقاضا کرتی ہے کہ گرم سے گرم پیرائیہ بیان اختیار کیا جائے۔ یہ دعوت ایک طرف تعاون علی البر کے لیے الفت و شفقت سے اپیل کرتی ہے' اور دوسری طرف یہی ونخلع ونترک من یفجرک کا مظاہرہ کرنے کے لیے غلظت و شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔

پھر یہ پہلے قدم پر جو کچھ ہوتی ہے' دوسرے قدم پر اس سے زیادہ وسعت اختیار کر لیتی ہے۔ پھر تیسرے قدم پر کسی اور انداز میں اور زیادہ زور دار ہمہ گیری کے ساتھ نمودار ہوتی ہے ------ یہاں تک کہ پورے معاشرے پر چھا جائے۔ یہ دعوت لڑاتی بھی ہے' اور صلح بھی کراتی ہے۔ یہ توڑتی بھی ہے' اور جوڑتی بھی ہے اور مختلف احوال و شیون سے گذرتی ہوئی اپنی تکمیل

کو پہنچتی ہے۔

اجتماعی انقلاب کی دعوت دینے والی کوئی بھی جماعت ہو --- اسلامی یا غیر اسلامی --- درحقیقت اس کا وجود ہمہ تن دعوت ہوتا ہے۔ جب کہ وہ اپنا ابتدائی تعارف کرا رہی ہو۔ اس وقت بھی دعوت ہوتا ہے۔ جب کہ وہ اپنی مخالف طاقتوں پر تنقید کر رہی ہو۔ اور اس وقت بھی دعوت ہوتا ہے جب کہ وہ برسراقتدار طاقتوں کے خلاف چارج شیٹ لے کر میدان میں آئے۔ کسی جماعت کا ایک اصول کے ساتھ موجود ہونا' اس اصول کی کسوٹی پر پیش نظر حالات کو پرکھنا' اس کے مطابق مسائل میں رائے دینا' اس اصول کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر نظام زندگی کی تبدیلی کا کوئی پروگرام پیش کرنا' اس کا حق ادا کرنے والی قیادت کو برسرعمل لانے کی کوشش کرنا' یہ سب کچھ ہمہ تن اس اصول کی طرف دعوت دینے کا ایک وسیع الاثر نظام کار ہے۔

بالکل اسی طرح جماعت اسلامی کا ایک اصول کی علمبردار جماعت کی حیثیت سے موجود ہونا' اور مختلف سرگرمیوں میں اس اصول کا مظاہرہ کرنا' تمام تر دعوت دین ہے۔ اس کا لٹریچر' اس کے ہینڈبل' اس کے پوسٹر' اس کے جلسے' اس کی ریزولیوشن اسکے بیانات' اس کی تنقیدیں' اس کے احتجاج' اس کے مظاہرات' اس کی پالیسی' اس کی مجلس شوریٰ کے فیصلے' اس کے ہفتہ وار' ماہانہ' سہ ماہی اور سالانہ اجتماعات' اس کی سوشل خدمات' اس کے کارکنوں کے ادبی حلقے وغیرہ ازسرتاپا اپنی مجموعی حیثیت سے اقامت دین کی دعوت ہیں۔ ایک اجتماعی انقلاب کی علمبردار جماعت کی سرگرمیوں کا مجموعہ دعوت ہوتا ہے' نہ یہ کہ دعوت اس کی سرگرمیوں کا ایک جز ہو۔

جن اصحاب پر دعوت کا یہ تصور اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ واضح نہیں ہے' ان کو جماعت اسلامی کی بہت سی سرگرمیاں دعوت کے ماوراء' بلکہ دعوت سے متضاد معلوم ہوتی ہیں۔ اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دعوت دین کو پس پشت ڈال کر' یا اسے ایک گونہ کمزور کر کے' کچھ دوسرے سیاسی کام کیے جا رہے ہیں۔

اس قسم کے حضرات جماعت اسلامی کی دعوت کے کسی نئے مرحلے میں داخل ہونے پر بہت ابراتے ہیں کہ یہ کیا ہونے لگا۔ چنانچہ جب جماعت "مطالبہ نظام اسلامی" کی ابتدائی تحریک لے کے آگے چلی تو بھی ان کو کھٹک ہوئی۔ پھر جب انقلاب قیادت کی صدا بلند کی گئی تو اس وقت بھی ان کو الجھن ہوئی۔ پھر جب شرکت انتخابات کا فیصلہ کیا گیا تو بھی ان کو شکایت ہوئی کہ جماعت دین سے سیاست کی طرف لڑھک گئی ہے۔ علی ہذالقیاس اب جب "اجتماعی مظاہرے" کا نیا مرحلہ سامنے آیا تو اس پر ان حضرات کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ کجا دعوت دین اور کجا احتجاجی

مظاہرے حالانکہ یہ سب کچھ عین جائز اور حق ہے اور یہ سب کچھ دعوت دین سے الگ نہیں۔

یہ دعوت دین کا تصور جب تک درست ہو کر اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ ذہنوں میں جاگزیں نہ ہوگا' ہمارے بہت سے معترضین اور خیرخواہ جماعت اسلامی کے بارے میں رائے قائم کرنے پر قادر نہ ہو سکیں گے۔

خدا جانے کہاں سے یہ عجیب و غریب تخیل بھی دلوں میں آ گھسا ہے کہ جو دین کی دعوت دے' وہ بس دعوت ہی دے' کچھ اور نہ کرے۔ ایک داعی جماعت کے لیے یہ جائز نہیں سمجھا جاتا کہ وہ اقتدار پر تنقید کرے' یا اس سے کسی اجتماعی حق کا مطالبہ کرے' یا اس کے مظالم کے خلاف احتجاج کرے۔ اس نظریے کے لیے خود دین میں کوئی دلیل نہیں ہے' بلکہ درحقیقت یہ بھی ایک نتیجہ ہے جامد ذہنیت سے متاثر چلے آنے کا۔

احتجاج کو تحریک اسلامی سے فی نفسہ کوئی منافات نہیں ہے۔ ایک اسلامی تحریک کا احتجاج خود دعوت بن جاتا ہے۔ اور اس کے ذریعے حکومت اور رائے عام دونوں کے سامنے حق واضح ہوتا ہے' اور باطل کی تردید ہوتی ہے!

لیکن سوال صرف احتجاج تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ دین کے بہت سے رمز شناسوں کو اصل اختلافات احتجاجی مظاہروں سے ہے۔ مظاہرہ ان حضرات کے لیے ایک غیردینی سی کارروائی ہے' یا دنیوی سیاست کا ایک طریق کار ہے۔ یہ احساس بھی درحقیقت اسی بنیادی تصور دین و سیاست کے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔

قابل غور یہ ہے کہ مظاہرے کی اصل حقیقت کیا ہے؟

ایک ہوتا ہے فرد کا احتجاج کسی فرد کے ظلم کے مقابلے میں۔ دوسری طرف ایک جماعت کا احتجاج ہوتا ہے کسی نظام اجتماعی کی زیادتیوں کے خلاف۔ اور ان دونوں کی حیثیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ظالم فرد کے ظلم کا دائرہ محدود ہوتا ہے' لیکن ظالم نظام کے ظلم کے اثرات دور رس ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک مظلوم فرد کی مظلومیت کے مقابلے میں ایک جماعت اور ایک قوم کی مظلومیت بہت بڑے درجے کی ہوتی ہے۔ آخرالذکر کی لپیٹ میں ہزاروں افراد بلکہ پورے ملک کا مفاد آتا ہے'

اس فرق کے پیش نظر' ایک فرد کے محدود احتجاج کے مقابلے میں ایک جماعت کو وسیع تر احتجاج کرنا پڑتا ہے۔ وہ ظلم کی مدافعت کے لیے ایک قوم کی قوم کے جذبات ہمدردی کو اپیل

کرنے پر مجبور ہوتی ہے' چنانچہ فرد کا احتجاج اگر دو چار تلخ جملے کہہ دینے سے پورا ہو جاتا ہے' تو ایک جماعت کو اسی مقصد کے لیے سینکڑوں تقریریں نشر کرنی پڑتی ہیں۔ فرد ایک خط یا درخواست لکھ کر یا اخبار میں ایک مراسلہ شائع کرا ئے جس مقصد کو حاصل کر لیتا ہے' ایک جماعت اس کو حاصل کرنے کے لیے سینکڑوں پوسٹروں' محضرناموں' ہینڈبلوں اور کتبات کو استعمال کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ فرد کے لیے دو چار آدمیوں سے مل کر جذبات کا اظہار کر دینا نتیجہ خیز ہو سکتا ہے' لیکن جماعت کو پوری کی پوری قوم کے سامنے اپنے جذبات کی وضاحت کرنی پڑتی ہے۔ فرد کی مظلومیت کا مظاہرہ کرنے کے لیے اس کا چہرہ جتنا کام دے جاتا ہے' جماعت کو اتنے کام کے لیے ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک ایک منظم طاقت کو برسرعام لانا پڑتا ہے۔ پس اجتماعی نظام کے مظالم کے خلاف جماعتوں کے مظاہروں کی نوعیت ایک خاص طرح کی ہے' اور ان کا پیمانہ بہت وسیع ہوتا ہے۔

قدیم زمانے میں' جب کہ حکومتیں شخصی ہوتی تھیں' ان پر تنقید کرنے یا ان کی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھانے یا ان سے کوئی مطالبہ کرنے کے لیے یہ کافی ہوتا تھا کہ آپ کسی طرح دربار سلطانی میں پیش ہوئے اور اپنی بات پہنچا دی۔ لیکن آج کل کی حکومتوں کا دربار کسی چاردیواری کے اندر محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ پورے ملک میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ملکوں کی اصل حکمران طاقت رائے عامہ ہوتی ہے' اور وزراء اور پارلیمنٹ کے ممبر اس کے نمائندے ہوتے ہیں۔ یہ نمائندے کسی مطالبے' کسی شکایت' کسی احتجاج اور کسی تنقید پر صرف اس صورت میں توجہ دیتے ہیں' جب کہ انھیں محسوس ہو جائے کہ رائے عام کا دباؤ اس کی پشت پر موجود ہے۔ یہی بات عوام کے نمائندوں پر واضح کرنے کے لیے کہ کسی آواز کی پشت پر رائے عامہ کی طاقت موجود ہے' مظاہرات عمل میں لائے جاتے ہیں۔ دور حاضر کی حکومتوں کے عوامی طرز پر نشوونما پانے کے ساتھ' رائے عام کے مظاہرات ایک طبعی ضرورت پر ارتقاء پذیر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اور آج ان سے صحیح طور پر کام لیے بغیر کوئی تحریک پوری طرح کام نہیں کر سکتی۔

اگر مظاہرات کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو ا[illegible] کی ماہیت صرف یہ ہوتی ہے کہ ایک منظم طاقت نظام تمدن و سیاست کے خداوندوں اور [illegible] کے عوام کو اپنے احساسات سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس کی نگاہ میں فلاں فلاں کارروائی مضر' غلط اور ظالمانہ ہے اور اس کی روک تھام کی جانی چاہیے۔ بخلاف اس کے' فلاں چیز کرنے کی ہے' اور اسے عمل میں لانے کا اہتمام ہونا چاہیے۔

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مظاہرہ خود بکسر ایک دعوت اور ایک تبلیغ ہی ہوتا ہے۔ وہ دعوت و تبلیغ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مظاہرہ غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنے کی ایک عملی اور اجتماعی صورت کا نام ہے۔ وہ منکر کو منکر اور معروف کو معروف کہنے کا ایک وسیع الاثر پیرایہ ہے۔

مظاہرہ صرف حکمران طاقت ہی کو خطاب نہیں کرتا' بلکہ وہ رائے عام کی تربیت کا ذریعہ بھی بنتا ہے' مظاہرہ عوام ملک کے سامنے ایک مسئلے کو پوری طرح ابھار کر اور وقت کا اہم ترین سوال بنا کر پیش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جو اسے جانتا ہو وہ بھی اس پر سوچنے لگے' اور جو نہ جانتا ہو وہ بھی جاننے اور سوچنے پر مجبور ہو جائے' لوگوں میں اس مسئلے پر عام گفتگوؤں کا سلسلہ چھڑ جائے' دو طرفہ دلائل کا چرچا ہونے لگے' اور آہستہ آہستہ عوامی طاقت ایک حق کی حمایت اور اس کے برعکس باطل کی مزاحمت کے لیے یکسو ہو جائے۔

یہی مقصد تھا جس کے تحت حضرت امام مالکؒ نے عین اس وقت --- جب کہ ان کو اونٹ پر سوار کر کے اور ان کے چہرے پر سیاہی لیپ کر مدینے کی گلیوں میں گھمایا جا رہا تھا --- باواز بلند عوام سے قدم قدم پر یوں خطاب کیا کہ جو مجھے جانتا ہے وہ تو جانتا ہے' جو نہیں جانتا وہ بھی جان لے' کہ میں مالک ابن انس ہوں' اور میں کہتا ہوں کہ جبرواکراہ سے دلوائی ہوئی طلاق نافذالعمل نہیں ہوتی۔ آپ یہ کلمات کہتے ہوئے ہمہ تن ایک مظاہرہ تھے' منصور کے غلط نقطہ نظر اور اس کے ظالمانہ طرز عمل کے خلاف' اور اس طرح آپ رائے عام کو درحقیقت دین کی دعوت پہنچا رہے تھے۔

خود نبیؐ نے جب ایک مرحلے پر آکر پوری طرح محسوس کر لیا کہ اہل کتاب ہمہ تن فتنہ ہیں' اور روشن دلائل بھی ان کے ضمیروں کو نہیں چونکا سکتے' تو آپؐ نے آخری حربے کے طور پر ان کو مباہلہ کی دعوت دی' اور خود اہل بیت سمیت میدان میں آکر خیمہ زن ہو گئے۔ مباہلے کے طریق کار میں مظاہرے کا ایک پہلو بہرحال موجود تھا۔ اور فریقین کا اختلاف آپؐ کے میدان میں آکر خیمہ زن ہو جانے سے پوری پبلک کے سامنے اہم ترین مسئلے کی حیثیت سے آگیا۔ اور اہل کتاب کے فرار نے ان کی اخلاقی کمزوریوں کو اور آنحضور صلعم کی قوت یقین کو ساری دنیا کے سامنے واضح کر دیا۔

دلائل سے دعوت دیتے دیتے جب نبی صلعم نے مباہلہ کی یہ صورت اختیار کی ہو گی تو بظاہر یہ ایک انوکھی چیز محسوس ہوئی ہوگی۔ لیکن درحقیقت یہ بھی دعوت ہی کی ایک شکل تھی' جس کا

روئے سخن اہل کتاب کے ساتھ ساتھ پوری رائے عام کی طرف تھا۔ یہ ایک ایسا خطاب تھا جس نے ماحول کے ایک ایک کونے تک حق کی آواز پھیلا دی۔

پس مظاہرہ' اگر جائز حدود میں رہے' تو' اپنی حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے دعوت کا ایک وسیع الاثر ذریعہ ہوتا ہے۔ اور فی نفسہ اس میں دینداری کی کوئی نفی نہیں پائی جاتی' الا یہ کہ اس کے لیے پیرایہ اور طریق کار غلط اختیار کیا جائے۔

ایک خدشہ یہ محسوس کرایا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی کے سیاسی طور طریقوں کو اختیار کر لینے سے تعمیر سیرت و تقویٰ کا پروگرام کمزور ہو جائے گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اب تک جو سرمایہ اخلاق و کردار جمع کیا جا چکا ہے وہ بھی نقصان کا شکار ہو جائے۔ پس اگر ان سرگرمیوں کو اختیار کرنا ہی تھا تو ابھی کافی مدت تک سیاسی مصروفیات سے بچ کر داخلی تعمیر کا کام مکمل کر لینا چاہیے تھا۔

اس خدشہ کو سب سے پہلے خود جماعت اسلامی اور اس کے قائم کرنے والوں ہی نے پوری اہمیت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ اسی کے پیش نظر جماعت نے سات سال تک جلسوں اور مظاہروں سے اپنا دامن بچا کر' پہلے وہ نئی ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو ان وظائف سیاسی کو پرانی روایات سے پاک کر کے نئے انداز میں سرانجام دینے کے قابل ہو۔

جماعت اسلامی اپنے حلقہ اثر میں یہ گہرا احساس پہلے سے پیدا کر چکی ہے کہ سیاست کے خارجی اور نمائشی ہنگاموں کو اصل تحریک بنا لینا' اور ذہن و سیرت کی تعمیر کے لیے کوئی ٹھوس اہتمام نہ کرنا' کبھی بھی ایک اسلامی تحریک چلانے اور اس کے نتیجے میں اسلامی نظام قائم کر دکھانے میں کارگر نہیں ہو سکتا۔ ایک جماعت کی اصل قوت کار سیاسی مظاہرہ نہیں بلکہ اس کی محکم فکر اور اس کے کارکنوں کی ٹھوس سیرت ہوتی ہے۔ سیاسی مظاہرہ صرف ذرائع و وسائل ہیں جن کو وقتی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے اختیار کرنا پڑتا ہے۔

جماعت اسلامی کے وجود میں آنے سے قبل' تحریک مجاہدین سرحد کے بعد' کوئی ایسا نظام جماعت موجود نہیں تھا جو اسلام کے خطوط پر افکار و کردار کو ارتقاء دینے کے لیے کوئی ٹھوس طریق کار اختیار کرتا' بلکہ اس دوران میں ہماری ساری سیاست محض خارجی مظاہرے کے بل پر چلتی رہی ہے' اور خارجی مظاہرے سے جذبات میں تو حرکت آتی رہی ہے۔ لیکن شعور کی تربیت اور اخلاق کی تعمیر کا کوئی سامان نہ ہو سکا' بلکہ الٹا سیاست کے جذباتی مظاہرے نے مسلمانوں کے اجتماعی سیاسی کردار کا اور زیادہ خانہ خراب کر دیا ہے۔

چنانچہ جماعت نے ایک مدت تک ان جذباتی مظاہر کے فی نفسہ جائز ہونے کے باوجود ان سے اپنے کارکنوں کو پرہیز کرایا ہے' تاکہ کہیں نمائش پسندی اور کھوکھلی ہنگامہ آرائی کی پرانی عادات میں پھر جان نہ پڑ جائے۔

لیکن جب اس پہلو سے اطمینان ہو گیا تو آہستہ آہستہ بتدریج سیاسی حرکت کے لیے مختلف ذرایع و وسایل کو بانداز نو استعمال کیا جانے لگا۔

علاوہ بریں سیاست کے خارجی مظاہر ایک عرصہ دراز سے اسلام کی حدود سے آزاد چلے آ رہے تھے۔ جلسوں میں ہلڑ بازی' تقریروں میں جذباتی اشتعال انگیزی' جلوسوں میں غنڈہ گردی' نعروں میں دشنام طرازی' پوسٹروں میں جھوٹا پروپیگنڈہ' ہینڈبلوں میں فتنہ انگیزی' مظاہرات میں بے وقری' ہڑتالوں میں جبر و تشدد' ہماری سیاست کا لازمہ بنے چلے آ رہے تھے۔ چنانچہ جماعت نے اس بے اسلام سیاسی ہنگامہ آرائی کے ناپاک مظاہر کے خلاف ایک شدید نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ نفرت' ماضی کے ردعمل کے طور پر' بعض اصحاب میں حد ضرورت سے زیادہ پیدا ہو گئی ہے۔ وہ مظاہر سیاست کو اسلامی حدود کی پابندی میں محدود ہو جانے کے بعد بھی اسی طرح مکروہ اور مضر سمجھتے ہیں جس طرح وہ اس سے پہلے تھے۔

ہم نے عندالضرورت ایک حکیمانہ تدریج کے ساتھ ان تمام ذرایع و وسایل سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ جن کے بغیر کوئی تحریک عوامی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ لیکن ان سب کو پرانی ناپاک روایات سے پاک کر کے اسلامی اصولوں کے خراد پر گھما کر از سر نو ان کی نوک پلک بنائی ہے' اور مظاہر سیاسی کی نوعیت کو بدل دیا ہے۔ ٹھوس علمی لٹریچر کے ساتھ اب ہم پوسٹروں اور ہینڈبلوں سے بھی کام لیتے ہیں۔ اپنے مخصوص اجتماعات کے ساتھ ساتھ ہم اب جلسہ ہائے عام بھی کرتے ہیں۔ اصول دین کی دعوت کے ساتھ ہم حکومت کی اصلاح کے لیے مطالبے اور ریزولیوشن بھی سامنے لاتے ہیں۔ اور زبان و قلم سے اظہار جذبات کے پہلو بہ پہلو مظاہرات سے بھی کام لیتے ہیں ----

اور آگے چل کر ہمیں دوسرے مختلف جائز طریقے بھی ذرایع و وسایل کی حیثیت سے اختیار کرنے ہوں گے۔

لیکن ہم نے سیاست کے ذرایع و وسایل کو اسلامی حدود کا پابند بنا کر اتنا بدل دیا ہے کہ ہمارے پوسٹر' ہمارے جلسے' ہمارے بیانات' ہمارے ریزولیوشن' ہمارے مطالبے' اور ہمارے مظاہرے خود تعمیر فکر و سیرت کے نہایت موثر ذرایع بن گئے ہیں۔ وہ سیاست جو خالص دنیوی

خطوط پر چلتی رہی ہے' اس کے مظاہر یقیناً سیرت اور اخلاق کے لیے تباہ کن تھے۔ لیکن اب جب کہ سیاست کو دین کی شاہراہ پر ڈال دیا گیا ہے' اب یہ مظاہر خود تعمیر سیرت و اخلاق کے بہترین ذرائع ثابت ہو رہے ہیں۔ ہماری تمام سیاسی سرگرمیاں' جماعت کے کارکنوں کے لیے بھی اور عوام الناس کے لیے بھی' سنجیدگی' وقار' پابندی وقت' احترام نظم اور اہتمام اخلاق کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا ایک قابل قدر سامان بنتی جا رہی ہیں۔ اللہ کی اس عنایت پر ہم اس کے حد درجہ شکر گزار ہیں۔

وہ دنیا پرستانہ سیاست جس سے کنارہ کش ہوئے بغیر سیرت و تقویٰ کی تعمیر ممکن نہیں' اس کے ناپاک مظاہر سے جیسی نفرت ہمیں کل تھی ویسی ہی آج بھی ہے --- لیکن سیاست کے اسلامی حدود میں پابند ہو جانے کے بعد بھی' جو لوگ اس کے معتدل اور متوازن مظاہر کو تقویٰ کے منافی اور سیرت کے لیے مہلک سمجھتے ہوں' ان کے دل و دماغ میں یقیناً دین و سیاست کی تفریق کا نظریہ اب تک پناہ گزین ہے۔ حالانکہ وہ سیاست جس کا محور نظام اسلامی کے قیام کا نصب العین ہو' اور جس کے طریق کار کا ہر پہلو اسلامی حدود اخلاق کا پابند ہو' وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک اللہ کی عبادت ہے --- اور تمام نفل عبادات سے افضل عبادت ہے۔

یہ افضل ترین عبادت صرف ایسے لوگوں کے تقویٰ کے لیے تباہ کن ہوتی ہے جو سیاست کی ذمہ داریوں کو دین سے الگ سمجھتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے نزدیک سیاست کی ساری خدمات خود دین ہیں' وہ تو نظام اسلامی کے قیام کی جدوجہد میں جو قدم بھی اٹھاتے ہیں وہی ان کے لیے تعمیر تقویٰ کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ جماعت کے اکثر کارکنوں کا حال یہی ہے۔ وہ جب تانگے پر بیٹھے کوئی اعلان کر رہے ہوتے ہیں' دیواروں پر کوئی پوسٹر چسپاں کر رہے ہوتے ہیں' کسی اجتماع میں شرکت کے لیے مصروف سفر ہوتے ہیں' اور اسی طرح جب وہ کسی مظاہرے میں کتبات لیے چوراہے پر کھڑے ہوتے ہیں' تو ان ساری ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے آقا کی اطاعت و عبادت کی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ یہ کیفیت صرف ان قلوب کے لیے حرام کر دی جاتی ہے جو اسلامی سیاست کو بھی دین سے الگ کوئی چیز شمار کرتے ہیں۔

پھر یہ امر بجائے خود قابل غور ہے کہ زندگی کی جنگاہ سے الگ بیٹھ کر تعمیر سیرت کرنے کے لیے میدان کار ہے کہاں ؟ جسے پیراک بننا ہو' اسے بہرحال پانی کی موجوں کے اندر ہی پیرنا سیکھنا ہو گا' پانی سے باہر پیرنے کی کوئی تربیت گاہ اس آسمان کے نیچے کہیں موجود نہیں ہے۔ اخلاق و تقویٰ پیدا کرنے کے لیے روحانی کسرت کا کوئی مقررہ کورس نہیں ہے کہ ہنگامہ ہائے حیات سے الگ رہ

کر پہلے اسے پورا کر لیا جائے' اور پھر سند فراغت ملنے کے بعد اپنے آپ کو مختلف ذمہ داریوں میں مصروف کیا جائے۔

اخلاق و تقویٰ تو زندگی میں کودنے ہی سے پیدا ہوتا ہے' اور اسی حد تک پیدا ہوتا ہے کہ جس حد تک عملی سرگرمیوں میں حصہ لیا جا رہا ہو۔ خلوت میں رہیئے تو خلوت ہی کا تقویٰ پیدا ہو گا' جلوت کا تقویٰ خلوت میں نہیں آ سکتا۔ اس کے لیے تو جلوت ہی میں آنا پڑے گا۔ کاروبار کا تقویٰ صرف کاروبار کرنے کے دوران میں پیدا کیا جا سکتا ہے' مسجد میں نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ میدان جنگ کا تقویٰ تیغ و تفنگ کے ہنگامے میں کود پڑنے والوں ہی کو حاصل ہو سکتا ہے' سبکساران ساحل کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں مل سکتا۔ بالکل اسی طرح سیاسیات کا تقویٰ --- جو عام انفرادی سرگرمیوں کے تقویٰ سے بہت ہی بلند مرتبہ ہے --- سیاسیات سے دامن بچا کر پیدا کرنا ناممکن ہے۔ اسے جب بھی آپ پیدا کرنا چاہیں گے تو آپ کو لازماً میدان سیاست میں قدم رکھنا ہو گا۔ رضائے الٰہی کو اپنا مقصود بنا کر آپ حدود اللہ کی پابندی کرتے ہوئے جس سرگرمی میں بھی حصہ لیں گے وہ عین عبادت بن جائے گی' اور آپ کے اندر اخلاق و تقویٰ کی تعمیر کا وسیلہ ثابت ہو گی۔ لیکن اگر یہ نہ ہو تو پھر آپ کو خود اپنی ہر حرکت پر محسوس ہو گا کہ یہ تو "دنیویت" ہے' اور یہ ذہن و سیرت کے لیے تباہ کن ہے۔ اس طرح آپ آخرکار مجبور ہو جائیں گے کہ کسی خانقاہ میں جا کے پناہ لیں' اور پھر پڑے رہیں "تصور جاناں کیے ہوئے"

بلاشبہ آپ کو اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے جو کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں' ان میں دنیائے تصوف کا یہ "تصور جاناں" نہیں ملے گا۔ بلکہ آپ جب بھی ادھر بڑھیں گے تو وہ غلط قسم کا تصور جاناں کہیں فضا میں کھو جائے گا۔ آپ اس کے پیچھے ہاتھ پھیلائے ٹاک ٹوئیے مارتے پھریں گے' لیکن اس کا سراغ نہ ملے گا۔ بخلاف اس عالم خواب کے سے تصور جاناں کے' ہماری سرگرمیوں میں آپ کو عالم بیداری کا ایک نیا تصور جاناں محسوس ہو گا' بشرطیکہ آپ دین و سیاست کی تفریق کے "حجاب اکبر" کو چاک کر کے آگے بڑھیں۔

یہ بلاشبہ درست ہے کہ ایک جماعت کو عوامی دور سے قبل ایک دور ابتدائی تیاری اور تعارف کا عبور کرنا پڑتا ہے' جس میں وہ سیاست میں براہ راست مداخلت کرنے کے بجائے بالواسطہ طور پر اثر ڈالتی ہے' اور عملی انقلاب کے لیے زمین ہموار کرنے کی خاطر سے ایک فکری انقلاب بپا کرنے کا اہتمام کرتی ہے۔ لیکن یہ سوال کہ اسے کب تک فکری انقلاب ہی پر اپنی توجہ مرتکز رکھنی چاہیے' اور عوامی دور میں قدم رکھنے سے کتنی مدت اجتناب کرنا چاہیے۔ اس سوال کا

انحصار جتنا اس کے داخلی حالات پر ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ خارجی تقاضوں پر بھی ہوتا ہے پھر داخلی اور خارجی تقاضوں میں توازن کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرتی ہے۔

جماعت اسلامی ابتدائی تیاری کے دور کو لمبا کرنا چاہتی تھی' لیکن حالات نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے میدان کار میں طلب کر لیا ہے۔ ہمارے ماحول میں اسلامی اور غیر اسلامی فکر کے درمیان جو آویزش دھیمی دھیمی چلی آ رہی تھی' وہ تقسیم ہند سے قبل ہی خاصی تیز ہو چکی تھی۔ لیکن آزادی اور تقسیم کے بعد وہ معاً انتہائی اشتعال پر پہنچ گئی۔ اب جب کہ حالات بتا رہے تھے کہ اس کشمکش کا فیصلہ ادھر یا ادھر بہت جلد ہونے والا ہے' اور آزادی کے بعد کے ابتدائی ۵ سال (یا زیادہ سے زیادہ ۱۰ سال) اسلام کے لیے بالکل فیصلہ کن ہیں' تو جماعت اسلامی کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ ہمہ تن "عشق" بنے اور "بے خطر آتش نمرود" میں کود جائے۔ اس موقع پر عقل کو محو تماشائے لب بام چھوڑنے کے علاوہ کوئی دوسری صورت تھی ہی نہیں۔ تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک انتہائی موڑ مڑنے والی ہے' اور اگر اسے غلط راستے پر جانے سے روکنے کے لیے فوراً ہی ایک منظم قوت اس کے آڑے نہ آئے' تو پھر یہ دریا' الحاد کے رخ بہ جانے کے بعد' جب کنارے کاٹتا ہوا' اپنی رودگاہ کو گہرا اور اپنے پاٹ کو چوڑا کر چکے گا' تو پھر اسے ایک نئی سمت میں موڑ دینا ایک محال کام ہو گا۔

یہ اللہ کا احسان ہے کہ جماعت اسلامی کے رہنماؤں نے اپنے ماحول' اپنی حریف طاقتوں' اپنے دور کی تاریخ اور اپنے وقت کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" کا ڈھنگ اختیار نہیں کیا' کہ چاہے تمدن و سیاست کی ساری بازی شاطر الحاد جیت جائے' لیکن وہ ایک گوشے میں بیٹھے سیرت کے کام میں لگے رہیں۔ جب اسلامی دشمن طاقتیں زندگی کے حرم کے دروازے توڑ کر اس پر اپنا جھنڈا لہرانے کے لیے آخری ہلہ بول رہی ہوں' تو ان لوگوں کی سیرتیں اور تقویٰ کس کام کا جو اپنی جانوں کو بچانے کے لیے گھروں کے دروازے بند کیے بیٹھے رہیں۔ جماعت اسلامی نے جس روز مطالبہ نظام اسلامی تحریک شروع کر کے عوامی دور میں قدم رکھا ہے' حالات گواہ ہیں کہ یہ کام اس روز موخر کرنا مہلک ہوتا۔ وقت کی پکار کو اگر ہم لوگ اس کان سے سن کر اس کان اڑا دیتے' تو آج "قرارداد مقاصد" میں جوہر اسلامیت کا کوئی نام و نشان نہ ہوتا' بلکہ یہ کھلم کھلا لادینی ریاست کی تعمیر کا ایک اسلام کش اعلان ہوتی' اور آج ہماری مملکت کی گاڑی غیر اسلامی راستے پر نہایت تیزی سے دوڑ رہی ہوتی۔

پس اب جب کہ ایک قدم اٹھ چکا ہے' اس کے واپس لینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

بلکہ اب اسے آگے ہی آگے بڑھنا ہے۔ اب اس کا رکنا یا پیچھے ہٹنا --- چاہے وہ تعمیر سیرت ہی کے لیے کیوں نہ ہو --- ایک معرکہ کشمکش سے فرار کی حیثیت رکھتا ہے' اور فرار ایک انقلابی تحریک کے لیے ہمیشہ موت ثابت ہوتا ہے۔ اس فرار کے بعد ایک جماعت محض مذہبی فرقہ یا سیاسی جتھا بن کے رہ جاتی ہے' وہ زمانے کی امامت نہیں کر سکتی۔ ان حالات میں ہمارے نزدیک یہ ناگزیر ہے کہ تعمیر سیرت کے لیے جو کچھ بھی اہتمام کیا جائے وہ اس کشمکش کو جاری رکھتے ہوئے کیا جائے جو ایک فرض بن کر ہمارے اوپر لازم ہو چکی ہے۔

اب یہ ممکن نہیں ہے کہ عوامی دور میں قدم رکھنے کے بعد' ہم لوگ ان ذرائع و وسایل سے کام نہ لیں جو سیاست کے عوامی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ چنانچہ مولانا مودودیؒ سے' جب ۱۹۴۸ میں کراچی کی تقریر کے بعد' یہ سوال کیا گیا کہ آپ مطالبے کو منوانے کے لیے کن طریقوں سے کام لیں گے' تو موصوف نے صفائی سے یہ جواب دیا تھا' کہ ہمیں اس کے لیے وہ سارے ذرائع اختیار کرنے ہوں گے جو آپ نے مطالبہ پاکستان کے لیے اختیار کیے تھے۔ (ان کے خلاف اسلام پہلوؤں کا استثنیٰ بہرحال اپنی جگہ پر مسلم ہے)

اوپر کی گزارشات کا منشا صرف یہ ہے کہ اسلام کے ایک تحریک کی صورت میں ارتقاء کرتے ہوئے طبعی طور پر جو مراحل اسے پیش آ رہے ہیں اور آنے والے ہیں ان کو ہمارے معترضین اور ہمارے خیرخواہ دونوں جامد مذہبیت اور دین و سیاست کی تفریق کی عینکوں سے نہ دیکھیں' اور قدم قدم پر اڑانا چھوڑ دیں۔

دماغوں کو بلند فکر بنایئے' نگاہوں کو دور رسی کا درس دیجیے' سینوں کو فراخ رکھیے' اور حوصلوں کو عالی ظرفی کی صفت سے آراستہ کیجیے' یہاں تک کہ آپ پیش آمدہ مراحل کے تقاضوں ہی کو نہیں' بلکہ مستقبل بعید میں بتدریج پیش آنے والے احوال و مقامات کی ذمہ داریوں کو بھی قبل ازوقت سمجھ سکیں۔ آپ کو اپنے ملکی ماحول ہی کو نہیں' جہادنی ماحول کو تفصیل سے سمجھنا چاہیے۔ آپ کو تاریخ کی سمت ارتقاء اور وقت کے بہاؤ کی رفتار کو جاننا چاہیے۔ آپ کو اسلام کی وسعتوں پر نگاہ رکھنی چاہیے۔

اس کے بغیر اسلام کی انقلابی تحریک کے ہر نئے مرحلے میں داخلے کے وقت آپ کو خواہ مخواہ کی الجھن ہو گی۔

خود ہمارے لیے یہ صورت حال بہت ہی مضر نتائج رکھتی ہے کہ ہم اپنی ساری قوت صرف

بقیہ صفحہ ۵۲ پر

رسائل و مسائل

سوال : ماہنامہ ترجمان القرآن بابت ماہ مئی ۱۹۹۳ء میں آپ نے قربانی کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ حضورؐ نے ان قربانی کے اونٹوں کے کوہانوں کو زخمی کیا' گلوں میں جوتوں کے ہار ڈالے۔ پھر ان جانوروں کو قربانی کے لیے روانہ کر دیا گیا۔

آپ ہمیں حضورؐ کے عمل زیر بحث کے ماخذ اور اس کی اہمیت و ضرورت کے بارہ میں وضاحت سے بتائیں کہ حضورؐ نے قربانی کے اونٹوں کو کیوں زخمی کیا اور ان کے گلوں میں جوتوں کے ہار کیوں پہنائے ؟

جواب : قربانی کے اونٹوں کے سلسلہ میں نبی کریمؐ کے فعل کے بارہ میں آپ نے سوال کیا ہے' اس کی روایت کا ماخذ صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے' جسے صاحب مشکوۃ نے کتاب المناسک' باب الھدی کے تحت سب سے پہلے درج کیا ہے۔ اس مضمون کی روایت ابوداوٗ میں بھی ہے۔

عن ابن عباس قال ... ثم دعا بناقته فاشعرھا فی صفحته سنامھا الایمن وسلت الدم وقلدھا بنعلین الخ

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے ... پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اونٹنی کو طلب فرمایا' اس کا اشعار کیا' یعنی اس کے کوہان پر داہنی طرف تلوار سے زخم لگایا' جس سے خون نکلا' پھر دو جوتے اس کی گردن میں ڈال دیے۔

سیرت کا بیان لکھتے ہوئے ہر بات کا بلاکم و کاست لکھنا دینی فرض' اور علمی دیانت کا تقاضا ہوتا ہے۔ لیکن بعض باتیں' میں خصوصی تربیتی مقاصد کے لیے بھی بیان کرتا ہوں' حضورؐ سے ہمارا تعلق کامل انقیاد و اطاعت' مکمل اعتماد' اور ہر چیز سے بڑھ کر محبت کا ہونا چاہیے' کہ یہی ایمان کا تقاضا ہے۔ مجھے یہ احساس تھا کہ آپؐ کا یہ فعل بعض لوگوں کو اجنبی' عجیب' اور تہذیب و شائستگی کے معیار سے فروتر لگے گا۔ اس طرح ان کو اپنے ایمان کے جانچنے' اور اس کی اصلاح کرنے کا موقع مل جائے گا۔

مطلوب وہ ایمان ہے جو حضورؐ کی ہر سنت کے آگے یسلموا تسلیما" کی تصویر بن جائے' دل میں کوئی خلش اور تنگی نہ ہو۔ آپؐ کی کسی سنت کو کسی انسان کی عقل' یا انسان کے خود ساختہ تہذیب و شائستگی کے معیارات' یا مغرب کے تصورات پر تول کر اس کے معقول' مہذب اور قابل قبول ہونے کا فیصلہ کرنا' مومن کے لیے قابل قبول نہ ہونا چاہیے۔

غور کیجیے تو حج کی عبادت عشق و محبت کا عنوان ہے۔ اس کے اور کتنے ہی مناسک انسان کے خود ساختہ معیارات پر کہاں پورا اترتے ہیں۔ ایک لق و دق میدان میں وقوف' اور پتھروں کے ایک گھر کے گرد دیوانہ وار چکر لگانے اور اس کے در و دیوار سے چوما چاٹی کرنے کے لیے اتنا لمبا سفر کرنا' پراگندہ بال اور پراگندہ حال پہنچنا۔ یہ سب بھی عجیب باتیں لگتی ہیں۔ اشعار تو دور کی بات ہے' فی نفسہ قربانی ہی کو ایک وحشیانہ اور ضیاع مال پر مبنی فعل قرار دیا جاتا ہے۔ اسی منطق سے پھر اسلامی حدود کو بھی ظالمانہ اور وحشیانہ سمجھا جاتا ہے۔

حضورؐ سے تو ہمیں ایسی محبت ہونا چاہیے جو ہر محبت سے بڑھ کر ہو۔ محبت میں غرق عاشق کے دل میں یہ گنجائش کہاں پیدا ہو سکتی ہے کہ محبوب کے کسی فعل کے بارہ میں یہ سوچے کہ یہ کیا کیا' یا سوال کرے کہ کیوں کیا۔ محبوب کی ہر ادا اس کو محبوب ہوتی ہے۔

حکمت بیان کرنے کی تو اس لیے چنداں ضرورت نہیں' کہ حضورؐ کا کرنا خود ہی سب سے بڑی حکمت اور دلیل ہے۔ پھر بھی شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں : اشعار کی حکمت' اللہ کی تو یہ شان اور ملت حنیفیہ کے احکام کا ایسے طریقہ پر اظہار ہے کہ ہر ایک کے دیکھنے میں آئے۔ نیز یہ کہ قلب کے فعل کو کسی محسوس عمل سے ظاہر اور نمایاں کیا جائے۔ قلب کا فعل کیا ہے؟ اطاعت' محبت' فدائیت' قربانی' تذلل۔ جسم پر تلوار کا نشان' اور گلے میں جوتے --- اسی کا مظہر ہیں۔ پھر یہ نشان اس لیے تھا کہ قربانی کا جانور پہچانا جائے' گم ہو جائے تو تلاش کر لیا جائے' اور کوئی اس پر ہاتھ نہ ڈالے۔

اس سنت میں حضورؐ کی اصلاح و تشریع کی بنیادی حکمت عملی بھی مضمر ہے' جس کو سامنے لانے کی خاطر بھی میں نے اس واقعہ کو بیان کیا۔ وہ یہ کہ حضورؐ نے معاشرہ میں رائج اور معروف رسوم و روایات میں سے صرف ان کو ختم کیا جو غلط تھیں۔ جو اصلاح طلب تھیں' ان کی اصلاح کر دی۔ جن میں کوئی حرج نہ تھا' انھیں آپ نے برقرار رکھا' مٹایا نہیں۔ جوتے گلے میں ڈالنے کا رواج زمانہ جاہلیت ہی سے چلا آ رہا تھا' اور شاید اس سے پہلے سے۔ آپؐ نے اسے برقرار رکھا۔ حج کے لیے ان کی چنداں اہمیت نہیں۔ ہمارے ایمان کے لیے بہت اہمیت ہے' کہ ہم اپنی

عمل اور پسند کو سنت رسولؐ کے آگے جھکا دیں' آپؐ کے تابعدار بن جائیں' اور آپؐ کی ہر ادا کو محبوب رکھیں۔

(خرم مراد)

سوال : روزنامہ جسارت کراچی کے فرائیڈے اسپیشل مورخہ ۲۱ تا ۲۷ مئی ۹۳ میں آپ کا انٹرویو پڑھا جس میں آپ نے تحریک اور ملی سیاست کے حوالہ سے متعدد سوالوں کے جوابات دیئے ہیں۔ پارٹی ڈسپلن اور ممبر اسمبلی کے ضمیر کے حوالہ سے آپ کا جو نقطہ نظر سامنے آیا ہے اس کی روشنی میں حالیہ بحال شدہ قومی اسمبلی میں وزیراعظم پاکستان کو اعتماد کا ووٹ دینے پر جماعت اسلامی کے رکن قومی اسمبلی اور ایسی ہی صورت حال میں پنجاب اسمبلی کے جماعت اسلامی کے ایک رکن کو اظہار وجوہ کے جو نوٹس دیئے گئے ہیں --- وہ کہاں تک درست ہیں ؟

جواب : اسمبلی سے پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی پر' نشست سے محروم کیے جانے پر' میری رائے دو متضاد تقاضوں کے درمیان تطابق کی کوشش ہے۔ ایک طرف ذاتی مفاد' یا حکومتوں کی اکھاڑ پچھاڑ کی غرض سے فلور کراسنگ کا مسئلہ ہے' جس کا تقاضا ہے کہ اس کی قانونی روک تھام کی جائے۔ دوسری طرف ایک فرد کے ضمیر کا معاملہ ہے' جس کا تقاضا ہے کہ اس کو اپنے ضمیر کے مطابق رائے دینے کا حق دیا جائے۔ مثلاً اگر اس سے پارٹی سود کے جواز کے حق میں ووٹ دینے کو کہے تو یہ نہ صرف ضمیر کے خلاف ہو گا' بلکہ گناہ بھی ہو گا ۔۔۔

اگر آپ غور کرتے تو میں نے ان دونوں متضاد تقاضوں کا لحاظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ میری رائے میں اگر رکن اسمبلی کے اقدام یا ووٹ سے "پارٹی کی حکومت ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہو جائے" یا وہ "اپنی پارٹی چھوڑ کر دوسری پارٹی میں شامل ہو جائے" تو اس کی نشست خالی ہو جانا چاہیے۔ اس سے اعتماد و عدم اعتماد کے ووٹ میں پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی اور تمام ہارس ٹریڈنگ کی جڑ کٹ جاتی ہے' ضمیر مطمئن نہ ہو' پارٹی کی حکومت کو خطرہ بھی نہ لاحق ہو' تو اسے پارٹی لائن کے خلاف ووٹ دینے کی اجازت ہونا چاہیے۔ اب جس طرح ہر صوابدیدی اختیار عدالتی تنقیح کی زد میں آ سکتا ہے' قانون ایسے اصولی معاملات کی خود بھی تشریح و توضیح کر سکتا ہے' اور مزید' عدالتوں کو بھی اختیار دے سکتا ہے۔ ضمیر کی پیمائش کا تو کوئی آلہ یقیناً نہیں' لیکن معاملہ کی اصولی حیثیت کے تعین کے پیمانے ضرور ہیں' اور وضع کیے جا سکتے ہیں۔

پارٹی کا معاملہ زیر جائزہ اس لیے نہیں ہو سکتا کہ وہ ممبر اس پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہوا ہے۔ اگر وہ پارٹی کے طے کردہ اصول و ضوابط سے اختلاف رکھتا ہے تو اسے اس پارٹی کا ٹکٹ ہی نہ لینا

چاہیے تھا۔ یا اگر پارٹی بدل گئی ہے' تو وہ کسی معاملہ میں ووٹ دینے سے پہلے' استعفیٰ دے کر دوبارہ انتخاب لڑے۔ یہ دیانت و اخلاق کی راہ ہے۔

آپ غور فرمائیں تو میرے نقطہ نظر سے قومی و صوبائی اسمبلیوں میں جماعت اسلامی کے ممبران کے ووٹ کا مسئلہ قانون کی زد میں بھی آ سکتا ہے' اور ان کے خلاف جماعت کی کارروائی بالکل بجا ہے۔ جماعت کی حکومت نہ تھی کہ اس کے ٹوٹنے کا خطرہ ہوتا' اور ووٹ کسی اصولی معاملہ کے بجائے' نواز شریف یا وٹو کی حکومت قائم رکھنے کے لیے تھا۔

السلطان ظل اللہ ------ کا مفہوم

سوال : آپ سے درخواست ہے کہ براہ کرم اس سوال کا جواب مرحمت فرمائیں۔

(۱)۔ السلطان ظل اللہ فی الارض من اھان سلطان اللہ فی الارض اھانہ اللہ

کیا یہ الفاظ کسی حدیث پاک کے ہیں۔ اور اگر حدیث پاک کے ہیں تو کیا یہ حدیث صحاح ستہ کی کوئی حدیث ہے ؟

(۲)۔ نیز اگر صحاح ستہ یا غیر صحاح ستہ میں کسی بھی جگہ نقل ہوئی ہے تو اس کی صحت اور صحیح مفہوم کیا ہے۔

جواب : السلطان ظل اللہ . . . کے الفاظ حدیث میں وارد ہیں۔ مشکوۃ کتاب الامارہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی حدیث درج ذیل ہے :

"سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول' من اھان سلطان اللہ فی الارض اھانہ"

(جس نے زمین میں سلطان اللہ کی اہانت و توہین کی' اللہ تعالیٰ اسے بے عزت کریگا۔)

کنزالعمال حدیث نمبر ۱۴۵۸۰ میں سنن بیہقی و طبرانی کے الفاظ یہ ہیں۔

"سلطان ظل اللہ فی الارض فمن اکرمہ اکرمہ اللہ ومن اھانہ اھانہ اللہ"

(سلطان زمین میں اللہ کا سایہ ہوتا ہے جو اس کا اکرام و احترام کرے' اللہ تعالیٰ اس کی عزت افزائی فرمائے گا اور جو اس کی توہین کرے اللہ تعالیٰ اسے رسوا کریگا۔)

سنن ترمذی' اشراط الساعۃ میں اس حدیث کو حسن غریب قرار دیا۔ جو لائق استناد اور قابل اعتماد ہے۔

میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں' اس حدیث میں سلطان کے لفظ کا اطلاق کسی شخصیت

Personality پر نہیں بلکہ ادارہ واقتدار Institution پر ہوتا ہے۔ ارشاد نبویؐ سے مراد میرے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود وقیود میں پابند خلافت علی منہاج النبوۃ' اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا پرتو ہے' جو مسلم معاشرے پر سایہ فگن ہے۔ جو اس ادارے کی تعظیم و تکریم کرے گا اللہ تعالیٰ اسے عزت بخشے گا اور جو اس ادارے کی توہین و تذلیل کرے گا' اللہ تعالیٰ اسے دنیاو آخرت میں رسوا کرے گا۔

قرآن مجید کی کسی آیت یا کسی حدیث کا کوئی ایسا مفہوم اخذ کرنا درست نہیں جو دوسری نصوص قرآن و سنت سے ٹکراتا ہو۔ اہل مغرب میں بادشاہت کا اور ظل اللہ یعنی Devine Right of Kings کا جو تصور رائج رہا ہے' اسلامی تعلیما کی رو سے وہ بالکل باطل اور خالص شرک ہے۔ بلاشبہ مسلمان حکمران جو مسلمانوں کی آزاد مرضی سے منتخب ہوتے ہیں' جب تک وہ اپنے اقتدار کو فی الجملہ حدود اللہ کے تحت استعمال کریں' ان کے اطاعت سے انحراف اور ان کے اقتدار سے اعراض وانکار نراجیت (انارکی) کے ہم معنی ہے۔ ہماری تاریخ میں اس کی نمایاں مثال فرقہ خوارج ہے جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد کسی سلطان وامیر کی امارت کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ ان کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ وہ دین کے دائرے سے ایسے نکل جائیں گے جیسے کہ تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دوسری طرف حدیث میں جابرو ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق بیان کرنا افضل الجہاد قرار دیا گیا ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ کسی مخلوق کی اطاعت اس حال میں جائز نہیں جب کہ اس سے خالق کی نافرمانی ہوتی ہو۔ "لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق" اسلامی ریاست سلطنت کا کوئی صاحب منصب' حتیٰ کہ وہ خلیفہ' اس کا کوئی عامل یا گورنر بھی شریعت کے آئین و قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ خلفائے راشدین اپنے مقرر کردہ قاضیوں کی عدالت میں مدعی یا مدعا علیہ کی حیثیت سے پیش ہوتے رہے ہیں اور عدالت کا فیصلہ اگر ان کے حق میں نہیں ہوا تو انہوں نے بسروچشم اپنے خلاف فیصلے کو تسلیم کیا ہے۔ اس سے سلطان کی اہانت نہیں ہوتی بلکہ اس کی تعظیم و تکریم ہوتی ہے۔

مولانا مودودیؒ رحمہ اللہ نے "تجدیدواحیائے دین" میں "جاہلیت کا حملہ" کے ذیلی عنوان کے تحت ایک مقام پر لکھا ہے۔

"بادشاہوں کو الٰہ کہنے کی ہمت باقی نہ رہی تھی۔ اس لیے السلطان ظل اللہ کا بہانہ اختیار کیا۔"

ان الفاظ سے حدیث زیر بحث کے بارے میں شبہ ہو سکتا تھا مگر درج ذیل حاشیے نے اسے رفع کر دیا۔ جو تجدید دین ص ۳۸ پر مطبوعہ موجود ہے۔ حاشیہ یہ ہے:

"اس میں شک نہیں کہ حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں مگر لوگوں نے ان کا بالکل غلط مفہوم لیا ہے۔ عربی زبان میں سلطان کے اصل معنی اقتدار کے ہیں۔ صاحب اقتدار کے لیے تو یہ لفظ محض مجازاً استعمال ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ کو اس کے اصل معنی میں استعمال فرمایا ہے نہ کہ مجازی معنی میں۔ حضورؐ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ حکومت واقتدار دراصل اللہ تعالیٰ کے اقتدار کا ایک پرتو ہے۔ جس شخص پر یہ پرتو ڈالا جائے وہ اگر اس کی عزت کو ملحوظ رکھے گا یعنی حق اور انصاف کے مطابق حکومت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو عزت دے گا اور جو شخص اس سایہ الٰہی کی اہانت کرے گا یعنی ظلم اور نفس پرستی کے ساتھ حکومت کرے گا' اللہ اس کو ذلیل کر دے گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکیمانہ ارشاد کو توڑ موڑ کر لوگوں نے بادشاہوں کو ظل اللہ قرار دے دیا اور حضورؐ کے منشا کے بالکل خلاف اس بادشاہ پرستی کے لیے ایک مذہبی بنیاد بنا ڈالا۔"

مصنف مرحوم کے اس حاشیے میں اور میری تشریح میں کوئی حقیقی تخالف و تضاد نہیں ہے۔ دونوں میں السلطان سے مراد کوئی فرد یا شخص نہیں لیا گیا جو ہیئت مقتدرہ پر فائز و متمکن ہو' بلکہ اقتدار فی نفسہ مراد ہے' البتہ اکرام و اہانت کا سزاوار ایک تاویل کی رو سے فقط صاحب اقتدار ہے اور دوسری تعبیر و تشریح کے لحاظ سے اس کا اطلاق حاکم و محکوم دونوں پر ہوتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

(ملک غلام علی)

بقیہ، اسلامی تحریک ۔۔۔ نئے مراحل میں

کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں' اور ہمارے معترضین سامنے سے آکر ہمارے لیے رکاوٹ بنیں' اور ہمارے خیرخواہ پیچھے سے پکڑ کر ہمیں کھینچ رہے ہوں۔

معترضین سے تو ہم زیادہ توقعات وابستہ نہیں کر سکتے' البتہ اپنے خیرخواہوں سے ضرور یہ امید کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا تصریحات پر وہ خاص طور پر غور و فکر کر کے جماعت کی راہ عمل کا ایک صحیح اندازہ قائم کریں گے' کہ وہ کدھر سے ہو کر کدھر کو جاتی ہے۔ یہ حقیقت اگر ایک مرتبہ ذہن نشین ہو جائے' تو پھر انشاء اللہ ایسا نہ ہو گا کہ قدم قدم پر آپ اپنے اندر ایک ذہنی انتشار محسوس کریں' اور ہر مرحلے پر ارشاد فرمائیں لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا (سورۂ کہف)

مطبوعات

چند حسینوں کے خطوط : کمال سالارپوری ناشر حسنات اکیڈیمی پرائیویٹ ۱۹' سی' منصورہ ملتان روڈ لاہور۔ صفحات ۲۵۲ ۔ قیمت ۷۰ روپے۔

مجھے بہت سے مجموعہ ہائے خطوط کو پڑھنے کا موقع ملا' اور ان کے مخصوص رنگستان کی گوناگوں دھاریوں کو دیکھ کر لطف اٹھایا۔ خطوط غالب' خطوط اقبال اور دوسری بہت سی شخصیتوں کے انشائیہ انداز اکثر کے سامنے ہیں۔ میں نے قریبی زمانے میں رشید صدیقی صاحب کے خطوط پڑھے اور کچھ طرز انشاء اور کچھ بیان واقعات اور کچھ خود اپنے ذاتی بلکہ جسمانی بھی احوال کے جمع ہو جانے سے عجیب و دلچسپ کہانی (ضمنی کہانیوں سمیت)وجود میں آتی ہے' مگر تذکرہ احوال میں ضروری اختصار بھی موجود ہے یعنی طویل مختصر افسانہ ہے۔۔

لیجئے۔ کمال سالار پوری کے مجموعہ خطوط کو سامنے رکھ کر میں کہاں کی ہر درز کے لیے نکل کھڑا ہوا پہلے حصے میں وہ خطوط ہیں جن کے فرستندہ کمال صاحب ہیں دوسرے میں وہ جن کے وہ یابندہ ہیں۔

کمال صاحب کے خطوط راست بیانی اور اجمال کے باوجود ادبی لطافت اور ہلکا سا مزاحیہ رنگ رکھتے ہیں اور شعروں کا استعمال بکثرت۔ حکیم اجمل خاں صاحب کو ایک دور کے درد مندانہ حالات لکھے ہیں ا۔ اس میں تقسیم کی بربا، کا نوحہ بھی ۔ اس خط کے چند شعروں میں سے ۰د ایک ؎

اے برق ! تو بھی ذرا تڑپی' ٹھر گئی — یاں مرکٹ گئی ہے ی اضطراب میں
کن آفتوں سے ہم نے نکالے ہیں دل کے بت — کیونکر چھٹا ہے ہم سے کلیسا نہ پوچھئے

خود کمال صاحب کو خط لکھنے والے اصحاب میں سے شاید تابش صاحب ن نصف ملاقات کا سلسلہ سب سے زیادہ رہا۔ دس خطوط شامل ہیں۔ خلوص' شاعری اور ادبیت کی جھلکیاں تحریر سے

ظاہر ہیں۔

شعرا کو کھانے چائے پر بلوا کر ان کا کلام سننے کی تقریب پیدا کی جاتی ہے۔ اس بارے میں کیا خوب چٹکی لی ہے۔ اشارہ شاعر کی طرف۔

"ہنہنایا ہے تو کچھ لید بھی کر!"

ایک اور کمال صاحب کا فنی افسانہ ٹائپ مختصر خط ہے۔

"ایک عرصہ بعد یاد فرمایا یاد آوری کا بہت بہت شکریہ امید ہے اب اگلے سال ہی یاد فرمائیں گے۔ (تحریر از مختار)" کمال صاحب کی محبت و مودت کے تقاضے کے علاوہ خالص ادبی رنگ سے کتنا جی چاہتا ہے کہ میں ان کے ۲۵۲ صفحوں پر کم سے کم ۲۵۲ سطریں تو لکھوں' مگر دل' دماغ' ہاتھ پاؤں قلم سب کچھ تقدیر کے آہنی بندھنوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مجبوری!

ہاں ایک دوستانہ بات! بزرگوں اور دوستوں کے خطوط" حسینوں کے خطوط والا عنوان جچا نہیں ۔اب حسینوں کو تو شامل گزٹ کریں اور جو حسین نہ ہوں ان کا مقدمہ خارج ۔ دوسری بات یہ ہے کہ حسینوں کے خطوط کا ذکر کرتے ہوئے یاد رکھیے کہ خطوط سے مراد صرف چٹھیاں ہی نہیں بلکہ حسن کی سرکار میں خطوط اور ستم کے خطوط ہوتے ہیں۔

بوسنیا: مولفہ خلیل حامدی صاحب ڈائریکٹر ادارۂ معارف اسلامیہ۔ ناشر ادارہ معارف اسلامیہ منصورہ ' لاہور۔ اسٹاکسٹ المنار بک سنٹر' منصورہ ملتان روڈ لاہور' صفحات تقریباً پونے تین سو۔ قیمت درج نہیں۔

وقت کا یہ نہایت اہم موضوع ہے۔ چھوٹا سا مسلمان ملک جو ایک زنداں ' مقتل ' تباہی اور نسائیت کی تذلیل کا عرصہ سے اڈا بنا ہوا ہے۔ بچارے بوسنی لوگ چاروں طرف سے صلیبیوں میں گھرے رہ کر اسلام کو فراموش کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اب یکایک عیسائی قسائی تعصبات کے چھرے لے کر ان مسلمانوں پر پل پڑے' معانی اور مصافی کی کیا تمیز' عورت مرد میں کوئی فرق نہیں' بچوں تک کے لیے انتہائی سنگ دلی۔ بوسنیا میں یکایک جذبہ اسلام جاگ اٹھا اور تحریک جہاد شروع ہوگئی' مگر نہ ہتھیار' نہ خوراک' نہ دوائیں' نہ ہسپتال' نہ جائے فرار' نہ پائے قرار۔ ان کے شریخ و بن سے اکھاڑ دیے گئے۔ ایک دن ایک حملے میں ۱۹ معصوم بچے ہلاک ہوئے۔ ایک عیسائی مبصر نے ان حالات کو دیکھ کر جل کر کہا کہ تم ظالم لوگ' خدا کرے جہنم کے اسفل ترین حصے میں ڈالے جاؤ۔

امریکہ اور یورپ کے مہذب لوگ مہینوں بیٹھے یہ تماشا دیکھتے رہے' آہستہ آہستہ مسئلے کے حل کی تدبیریں سوچی جاتی رہیں۔ آہستہ آہستہ سلامتی کونسل میں بحثیں چلتی رہیں' اور اس

دوران میں تباہی کی آگ نے دس گنا زیادہ انسانی جانوں اور اموال کو ہلاکت کے گڑھے میں ڈال دیا۔ دنیا بھر کو دہشت گرد قرار دینے والا تھانے دار بالکل پاس بیٹھا یہ سب دیکھ رہا ہے' اسے سربوں کی دہشت گردی اور نسل کشی اور حقوق کی تباہی نظر نہیں آئی جو ہر ۲۴ گھنٹے میں سربیا بوسنیائیوں پر تھوپ رہا ہے۔ کشمیر میں انڈیا کی دہشت گردی بھی دکھائی نہیں دیتی' اس کی کانی آنکھ کبھی ایران پر اور کبھی سوڈان پر اور کبھی پاکستان پر پڑتی ہے۔ انسانوں کو انسانی زندگی اس دن ملے گی جس دن یہ جعلی ارضی خداوند مٹ جائیں گے۔

مولانا خلیل حامدی نے بڑا کام یہ کیا ہے کہ بوسنیا جس سے ہم لوگ پہلے واقف نہ تھے اس کی پوری تاریخ' اس کا جغرافیہ نقشوں سمیت اس کتاب میں پیش کردیا ہے اور پھر باقاعدہ ایک رپورٹ کی شکل میں بوسنیا کے حالیہ دور مظلومی اور دور جہاد کی تفصیلات پیش کردی ہیں' نیز تباہی کے روداد بھی لکھ دی ہے۔

اب سربوں' کروٹوں اور بوسنیا والوں کے درمیان اس طرح علاقے تقسیم کیے جارہے ہیں کہ سب سے کم جگہ بوسنیا کے پاس رہے (اور وہ بھی مخلوط آبادی کے ساتھ) اور جو لاکھوں افراد تارکین وطن ہوتے ہیں'ان کے لیے کوئی جگہ ہی نکلنے کی نہ ہو۔ اسلحہ سے بھی بوسنیا کو اقوام متحدہ نے "مستقلاً" محروم کر رکھا ہے۔ نہایت دردناک کہانی ہے۔

دعا بھی کیجئے' اور بوسنیائی مظلوموں کو کھلے کپڑوں' غذاؤں اور دواؤں سے بھی مدد دیجئے۔

(ن – ص)

"تازہ بستیاں": ناصر قریشی' پروگرام مینجر پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن' لاہور' ناشر: مکتبہ عالیہ' شوروم اردو بازار لاہور' متوسط طباعت کے پونے دو سو صفحات' دلچسپ رنگین سرورق۔

۲۹ کہانیوں کا یہ مجموعہ اپنی مثال آپ ہے۔ نہایت سادہ انداز سے' بغیر فلسفیانہ' نفسیاتی پیچیدگیوں میں پڑے' یہ کہانیاں اس انداز سے لکھی ہوئی ہیں کہ ان میں ہماری روزمرہ کی زندگی بولتی نظر آتی ہے۔ ہم جدید نظریات کے حملوں میں اپنی ثقافت و معاشرت کے قیمتی اجزاء ضائع کر رہے ہیں جس کی آئینہ دار پچھلے دور سے اب تک کی کہانیاں ہیں۔ مگر ناصر قریشی صاحب نے پوری کوشش کی ہے کہ مجروح اقدار پر مرہم رکھیں۔ اس وجہ سے میں بطور خاص متاثر ہوا۔

ناصر قریشی صاحب پر کیا تبصرہ کریں' ان کے تو ہاتھوں سے اور نگاہوں کے سامنے سے بے شمار کہانیاں اور زندہ کہانیاں نکل چکی ہیں۔ اس لیے ان کا کمال یہ ہے کہ وہ چھوٹا سا (صحیح معنی میں مختصر) افسانہ لکھتے ہیں اور اس میں پوری ایک دنیا کھپا دیتے ہیں۔ یا یہ کہ اس کے دریچوں

سے زندگی اپنی ساری جلوہ سامانیوں اور اذیت رسانیوں کے ساتھ اس طرح دکھائی دینے لگتی ہے' جیسے کسی مصنوعی سیارے پر سے زمین کی تصویر لیتے ہوئے کیمرے نیو یارک اور ماسکو کی گاڑیوں کی نمبر پلیٹوں تک کو پڑھ کر بتا دیتے تھے۔ تشکیل پاکستان سے متعلق دور بھی آتے ہیں' اور خیروشر کی قوتوں کے نمائندے بھی "تازہ بستیاں" کی سکرین پر کرتب دکھاتے ہیں۔ مگر ناصر قریشی نے ہمیشہ جھوٹ اور ظلم اور باطل کو اپنے قلم کی طاقت سے نہایت پستیوں میں گرتا دکھایا ہے۔

ناصر قریشی صاحب سے ڈر بھی آتا ہے کہ بڑے بڑوں کی آنکھیں دیکھی ہیں اور مختلف اکابر ادب کے متعلق خوبصورت ایجازی اظہار رائے بھی کیا ہے۔ کاش کہ میں زیادہ لکھ سکتا اور بعض کہانیوں کا تجزیہ بھی کرتا۔ ن - ص)

بقیہ: قرآن کا نظریہ کائنات

بھی' یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ فرمان واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے ؟)

اس آیت کی پیش گوئی جس طرح پچھلی چودہ صدیوں میں پوری ہوئی ہے۔ آئندہ بھی ہوتی چلی جائے گی اور مسلسل ہو رہی ہے۔ اس مقالے کی ابتدا میں کائنات کے وجود کے متعلق جو آیت پیش کی گئی اس کی تصدیق سائنس کے تازہ ترین نظریے سے بھی ہوتی ہے' لیکن جس حقیقت کی طرف قرآن نے ڈیڑھ ہزار سال قبل اشارہ کردیا تھا اس تک پہنچنے میں سائنس کو اتنے ہی سال لگے۔ لہٰذا اگر حیات و کائنات کے متعلق قرآن کے اشارات پر ایمان رکھ کر علم و حکمت کی جستجو کی جائے تو انسان کی راہ طلب آسان ہوسکتی ہے اور ہر قسم کی ترقیات کی منزل مقصود قریب آسکتی ہے۔

REGD. NO. L 5340 PHONE : 234014 236665

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

کا ۱۹۳۲ میں جاری کردہ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر مسئول
خرم مراد

اُمت و انسانیت کے مستقبل کا رہنما رسالہ

اب مستقبل اسلام کا ہے!

• اسلامی زندگی کی تشکیلِ نو • مغرب کا تہذیبی و سیاسی تسلط • عالمِ اسلام: احیائے اسلام اور اسلامی تحریکات
• تزکیۂ نفس و اجتماع • پاکستان کے قومی مسائل

آپ کے ذہنوں میں سُلگتے سوال — ہمارے جواب

نیوز پرنٹ کی بجائے **سفید کاغذ** صفحات ۵۶ سے بڑھ کر ۸۸	تزئینِ نو کے بعد **پہلا شمارہ** **ماہ نومبر** **۱۹۹۳**	قیمت فی شمارہ ۱۰ روپے سالانہ چندہ ۱۰۰ روپے بذریعہ ہوائی ڈاک یورپ امریکہ: ۲۵ ڈالر دیگر ممالک: ۲۰ ڈالر	**آج ہی** اپنے ایجنٹ کو آرڈر دیں یا **سالانہ خریدار** بن جائیں

ایجنٹ آرڈر بُک کرا دیں

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ
اردو بازار، لاہور۔ فون نمبر 7234014 7236665